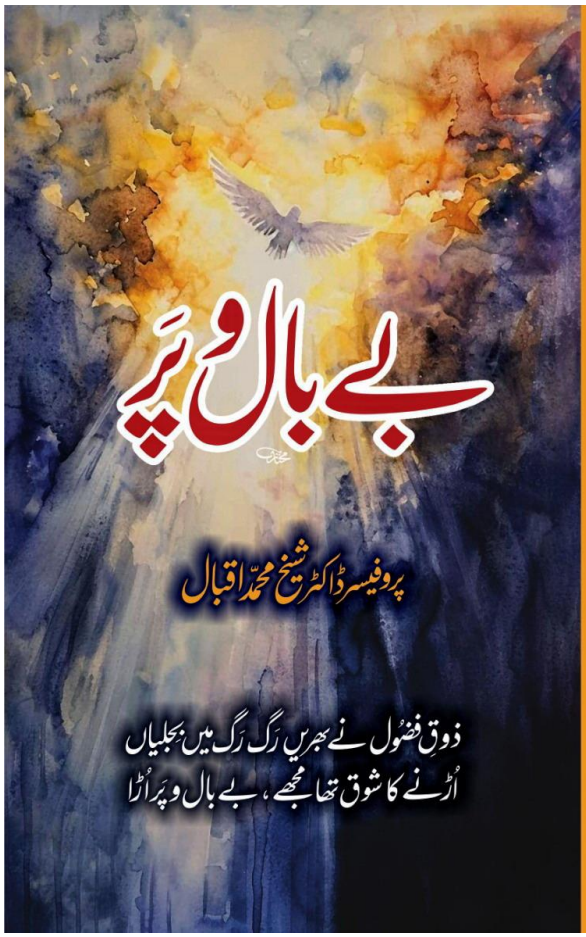

بے بال و پَر

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (تمغۂ امتیاز) کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین و مقالات تو میں ایک عرصے سے "الحمراء" میں پڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب کے وسیع مطالعے، فضیلت علم، تحقیقی و تنقیدی بصیرت اور فکر انگیز خیالات کا قائل اور گھائل تھا اور میرا ایقان تھا کہ شیخ صاحب کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور اردو، انگریزی، زبان و ادب کے اعلیٰ ڈگری یافتہ ہیں مگر میں ان کی ذاتی زندگی اور شخصیت کے بارے میں بالکل نابلد اور ناواقف تھا۔ ابھی حال ہی میں مجھے جناب شاہد بخاری اور جناب پروفیسر انور جمال کے ڈس ایپ پر صوتی پیغامات کے ذریعے ان کی شخصیت کی عظمت اور بڑائی کا پتا چلا تو میں حیرت زدہ رہ گیا کہ ظاہری آنکھوں کی روشنی سے محروم ایک نابغہ شخصیت اپنے باطن کی چشم بینا سے اخذ کردہ روشنی، علم و ہنر اور نور عرفان اپنی نگارشات کے ذریعے دوسروں کو عطا کر رہا ہے۔ ان سے آشنائی کی برکت سے مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ فطرت نے اُن پر شاعری کی دیوی کو بھی مہربان کر رکھا ہے اور وہ ایک منفرد رنگ کے حامل شاعر بھی ہیں۔ یوں بھی میں شاعری میں "تمیز الرحمٰن" کا قائل ہوں غالب کی طرح۔ پروفیسر انور جمال صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے بے شمار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن میری بدنصیبی کہ ترکی میں چھبیس سالہ قیام کے سبب میں ان کا ایک مجموعہ کلام تو کیا ایک غزل اور ایک نظم تک نہ پڑھ سکا تھا، میری محرومی کی انتہا ہے۔ ابھی چند روز پہلے مجھے علامہ اقبال کے ہم نام اور عقیدت مند ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے زیر طبع مجموعہ کلام "بے بال و پر" کے مطالعے کا موقع ملا، جو شاہد بخاری صاحب نے لاہور سے مجھے ڈس ایپ پر بھجوایا ہے۔ چند غزلوں اور چند نظموں کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی شیخ محمد اقبال کے خیالوں میں غیب سے مضامین آتے ہیں اور ان کی مصرعہ خامہ نوائے سروش ہی تو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان کے کلام سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے ذریعے قطرے میں دجلہ اور ذرے میں آفتاب دیکھا اور پایا۔ اُن کی چند نظموں میں، میں نے سامنے کی زندگی اور معاشرے کی تلخ و شیریں حقیقتوں کے متنوع رنگ دیکھے اور غزلوں میں محبت، جو کائنات کی کشش ثقل ہے کے سارے جلووں نے مجھے عرفان زیست بخشا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، علامہ اقبال کے عقیدت مند اور انہی کی طرح ادب و شعر کو انسانوں اور انسانی معاشروں کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کتاب زیست کے ہر ہر ورق کو دل کی آنکھ سے پڑھا اور سمجھا ہے اور اپنے اشعار کے ذریعے دوسروں کو پڑھانے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ گویا وہ ادب کی افادیت کے قائل ہیں اور ان کے کلام سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ محبت، انسان دوستی، حوصلہ مندی، جرأت و استقلال، مصائب کو سہنا، ہر حال میں اللہ کے احسانوں کو ماننا اور زندگی کو خوش دلی سے گزارنا ان کی شاعری کے نمایاں موضوعات ہیں۔ موضوعات کی طرح ان کی شاعری کا اسلوب بھی بہت خوبصورت اور دلنشین ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کی شاعری مسرت کے احساس سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت اور عرفان کے احساس پر ختم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اے بی اشرف
(افقہ۔ ترکیہ)

ISBN: 9789697462179
Rs. 500
www.qalamfoundation.pk
qalamfoundation2@gmail.com
0300-0515101 / 0309-4105484

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ وہ شاعر، ادیب، نقاد، افسانہ نگار اور مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فعال سماجی کارکن، براڈ کاسٹر، استاد اور منتظم بھی ہیں۔ انہوں نے متعدد ادبی، علمی اور سماجی تنظیموں کی بنیاد رکھی اور کامیابی سے ان کی قیادت کر رہے ہیں۔ ماہنامہ سفید چھڑی کے مدیر ہیں اور سینکڑوں افراد کے دل میں زندگی کی امنگ اور جذبہ پیدا کر چکے ہیں۔ خیر اور فلاح کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور ہماری دعا ہے کہ کبھی نہ رُکے۔

ان کی علمی و ادبی خدمات کا ہر سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔ قومی سطح پر انہیں ''تمغۂ امتیاز'' سے نوازا گیا تو عوامی سطح پر بھی ان کے ادبی کردار کے اعتراف میں انہیں کئی اعزازات و انعامات سے نوازا گیا، ان پر متعدد مقالات تحریر کیے گئے جن میں ایم فل کی سطح کے چار مقالے اور ایم۔ اے کی سطح کے کئی مقالے بھی شامل ہیں۔ مختلف ادبی تنظیموں اور اداروں نے انہیں اسناد عطا کیں، رسائل نے ان پر خصوصی نمبر یا گوشے شائع کیے اور اکادمی ادبیات پاکستان نے بھی ان کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب بہ سلسلہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' شائع کی۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شخصیت کو اتنی پذیرائی اور خراجِ تحسین حاصل ہو جائے تو اس کے اندر کی تخلیقی چنگاری مدھم پڑنے لگتی ہے اور ایک پرسکون انفعالیت غالب آجاتی ہے مگر ڈاکٹر صاحب کے ہاں ایسی انفعالیت کا دُور دُور تک کوئی نشان نہیں ملتا بلکہ ان کا تخلیقی اضطراب روز افزوں ہے اور انہیں نئی نئی منزلیں سر کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ متحرک اور مائل بہ عمل رہتے ہیں اور اپنے اندر مخفی توانائیوں کے ظہور کے لیے نئے نئے امکانات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ''بے بال و پر'' کے عنوان سے ان کا نیا شعری مجموعہ ان کی ادبی فعالیت اور تخلیقی اضطراب کا ثبوت ہے۔ یہ ان کا گیارھواں مجموعہ ہے اور ان کی پختگیٔ فکر اور قدرتِ اظہار کا مظہر ہے۔ وہ اپنے ادبی سفر کے اس مقام پر ہیں کہ جہاں انہیں اپنے کلام اور مجموعہ کلام کے لیے کسی تعارف یا تجزیے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہم سب کے لیے استاد اور علم و عمل کی ایک روشن مثال ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ انہوں نے اپنی محنت و کاوش سے علمی و ادبی سطح پر ایک خاص معیار قائم کیا ہے اور اس معیار سے کم تر پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ میں انہیں اس نئی کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتی ہوں اور اُمید کرتی ہوں کہ وہ اسی طرح تشنگانِ ادب کی سیرابی کا اہتمام کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف
صدر نشیں، اکادمی ادبیات پاکستان

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شعری کتاب "بے بال و پر" اسلوب و معانی کی کئی جہتیں رکھتی ہے۔ اگر انہوں نے "بے بال و پر" اپنی ذات کے لیے کہا ہے تو ان کی عجز بیانی ہے وہ تو دوسروں کو بال و پر دینے والی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ جو علمی روشنی پھیلائی ہے اس سے بہت سے چراغ روشن ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں اردو ادب کے علاوہ ڈاکٹر صاحب دنیا بھر کے ادب سے آگاہی رکھتے۔ ہیں اور خصوصاً انگلش ادب کے حوالے سے اُن کے تحریر کردہ مضامین خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ شیخ محمد اقبال علمی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ صحافتی میدان میں بھی گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ''سفید چھڑی'' کے نام سے ان کی نگرانی میں شائع ہونے والا میگزین نامساعد حالات کے باوجود شائع ہو رہا ہے۔ ماہنامہ ''سفید چھڑی'' نابینا لوگوں کے ساتھ ساتھ بینا لوگوں کی بھی راہنمائی کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بصارت اور بصیرت دونوں چیزوں کی کمی ہے۔ بصارت سے ہم باہر دیکھتے ہیں اور بصیرت سے ہم اپنے باطن کی زیارت کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری دنیا کی اکثریت بصارت اور بصیرت سے محروم نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شخصیت بصارت اور بصیرت دونوں صفات سے مالا مال ہے، وہ اپنے تخلیقی لمس سے جو کچھ دیکھ اور دکھا سکتے ہیں وہ آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریریں پڑھیئے اور نئی شعری کتاب "بے بال و پر" کا مطالعہ کیجئے، روشنی سے بھر جایئے اور اسی روشنی کے لیے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیجئے۔

نذیر قیصر - لاہور

بے بال و پر

(شاعری)

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

(تمغۂ امتیاز)

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

جملہ حقوق بحق شاعر محفوظ ہیں

2025ء

نام کتاب : بے بال و پر (شاعری)

شاعر : پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

باہتمام : علامہ عبدالستار عاصم، سلمان علی چودھری

قانونی مشیر: رانا شہناز احمد خاں (ایڈووکیٹ)

ناشر : قلم فاؤنڈیشن، انٹرنیشنل

ملنے کا پتہ

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ لاہور کینٹ پاکستان

0300-0515101 / 0309-4105484

qalamfoundation2@gmail.com

13۔لالہ زار پارک (الفاروق کالونی) یونیورسٹی روڈ سرگودہا

فون:048-3221532,0300-4489399

email:profdrshiqbal@gmail.com

شاہد بخاری ایڈووکیٹ

651/D فیصل ٹاؤن لاہور

0300-4855148

انتساب

بوستانِ روز و شب کے

چاند، تاروں

کلیوں اور پھولوں

کے نام

آنکھ کیا خاک دیکھتی ہو گی!
جو بِنا آنکھ دیکھتا ہوں میں

فہرست

حرفِ سپاس		9
شیخ محمد اقبال کے بال و پر	پروفیسر فتح محمد ملک	11
ڈاکٹر شیخ اقبال کی ''بے بال و پر'' کی اُڑانیں	نسیم سحر	15
ڈاکٹر شیخ اقبال کی دیدہ وری کا آئینہ	پروفیسر حسن عسکری کاظمی	23
شیخ اقبال ''تمغۂ امتیاز'' زندگی کے بیستوں کام ہُو	پروفیسر انور جمال	26
پروفیسر ڈاکٹر اقبال ایک ہمہ جہت شخصیت	ڈاکٹر فضیلت بانو	28
بے بال و پر کی بلند پروازیاں	محمد آصف مرزا	30
علامہ اقبال کا دیدہ ور	امجد بٹ	39
ڈاکٹر اقبال ایک محیر العقول برق رفتار تخلیق کار	شاہد بخاری	43
1۔ مرے لب پہ نعتِ رسولؐ ہے مری خلوتیں مری جلوتیں		45
2۔ بے نواؤں کا جو سہارا ہے		46
3۔ ہم کو تو بچپنا بھی ہمارا نہیں ملا		48
4۔ کشکولِ درد و داغ میں اک چشمِ تر تو ہے		49
5۔ زندگی اے زندگی (نظم)		51
6۔ تجھ کو جزوِ جاں بنانے کا ارادہ تھا مگر		54
7۔ دل ہوا مہرباں دیکھتے دیکھتے		55
8۔ صدائے بازگشت (نظم)		57
9۔ جاں کو بانہوں میں بھرتے رہتے ہیں		58

10۔ اُف اللہ! (نظم) 60
11۔ اک آس بندھا دیتی ہے پھولوں کی محبت 61
12۔ نہ جاں کی بے بسی اچھی، نہ دل کی بے کلی اچھی 63
13۔ حسن کی دیوی (نظم) 64
14۔ آنکھ کو اشکبار رہنے دے 65
15۔ آدنا رسا (نظم) 67
16۔ امتحاں در امتحاں ہو تو کیا ہوا 68
17۔ جادو گر شام و سحر تھے، تھے کبھی 70
18۔ پریم نگر (نظم) 72
19۔ زندگی اتنی دردِ سر تو نہ تھی 74
20۔ ہم تمہارے تم ہمارے تھے کبھی 75
21۔ درد کی پُروائی (نظم) 76
22۔ کیا حسن انوکھا تھا میں بھولا تو نہیں ہوں 77
23۔ بڑی مشکل سے دنیا سے نبھایا اور کیا کرتا 79
24۔ لبِ لعلیں (نظم) 80
25۔ جب گلشن جاں پہ برق گری تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا 81
26۔ وہ جتنے تیر تھے ترکش میں چل جاتے تو اچھا تھا 83
27۔ طائرِ وقت (نظم) 85
28۔ اک خوابِ پریشاں، مجھے بھولا تو نہیں ہے 87
29۔ خوف کا آسیب (نظم) 88
30۔ میرے دل میں تمنا جاگتی ہے 89
31۔ سوسن و گل کو کوئی دیکھنے والا ہی نہیں 90
32۔ ایک سوال (نظم) 91
33۔ بہار آئی گئی دل نڈھال کر ڈالا 92

34۔ یہ کیسا شہر ہے انساں پگھلتے رہتے ہیں 93
35۔ ہم کیا خاک سنبھلتے، رستہ بھول گیا 94
36۔ شبِ تیرہ (نظم) 95
37۔ حیراں ہوں میرے شہر میں کیا کیا بدل گیا 96
38۔ مدھر آواز (نظم) 98
39۔ اِک خیالِ خام اک وہم و گماں 99
40۔ سُر لافانی ہے (نظم) 101
41۔ ہم بنے ہیں عمر بھر آنسو بہانے کے لئے 102
42۔ منزلیں خواب پریشاں ہی سہی 103
43۔ جھوٹ زندہ باد (نظم) 104
44۔ میں تھک کے بیٹھ رہوں اتنا ناتواں بھی نہیں 105
45۔ زخم ہو گا اتنا گہرا، ہم نے سوچا تک نہ تھا 106
46۔ کتنا مشکل ہے چار دن جینا (نظم) 107
47۔ شکل و صورت سے گلستاں سا ہے 109
48۔ ہم پر ایک ایک لمحہ بھاری ہے 110
49۔ تمہارا چہرہ (نظم) 111
50۔ جینے کے لئے خونِ جگر اور چاہیے 113
51۔ پڑ گیا ہے خود سے چہرہ ڈھانپنا 115
52۔ واہ۔۔۔آہ! (نظم) 117
53۔ ہم کو اپنے قلب و جاں کو آزمانا چاہیے 119
54۔ خوف (نظم) 120
55۔ آدمی انسان ہے، کتنا پرانا جھوٹ ہے 122
56۔ جرأت کی بات کی مگر جرأت نہ کر سکا 124
57۔ یادیں تھیں میری ہمسفر (نظم) 126

58۔ فسردہ دل لگا دیتے ذرا تسکین ہو جاتی 128
59۔ وہی ہے سرو سمن دلکشی نہیں ملتی 129
60۔ زندگی اپنی سُونے گھر سی ہے 130
61۔ مجھے اک چارہ گر نے مار ڈالا 132
62۔ جب کسی دل میں کوئی عزم جواں ہوتا ہے 134
63۔ جب کوئی دیکھنے والا ہی نہیں 136
64۔ جو احترام کے قابل ہوں احترام کریں 138
65۔ انساں کو ستاتا ہے جو انسان نہیں کیا! 140
66۔ ہم ہیں ایک کونے میں زندگی حویلی ہے 142
67۔ مجھے گلستاں کی تلاش ہے مجھے بوستاں کی تلاش ہے 144
68۔ رُخِ دریا بدلتا جا رہا ہے 145
69۔ آنکھ سے کوئی دیکھتا ہی نہیں 147
70۔ سخت تھی آب و ہوا، کیا کرتا 149
71۔ حسنِ الفاظ کی ہے جادوگری 151
72۔ انسان تو آزاد ہے لاچار کہاں ہے! 153
73۔ جو بیتی ہے بھلا دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے 155
74۔ کون سنتا ہے بھلا رام کہانی میری 156
75۔ کیسے سچ بولتا جھوٹ تھا حکمراں 157
76۔ آ گئے ہم کہاں خدا جانے 158
77۔ دل میں ارماں بہت مچلتے ہیں 160
78۔ میں اپنے آپ سے گھبرا گیا ہوں، مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے 162
79۔ خودی (نظم) 163
80۔ بندۂ علامہ اقبال 165
81۔ سلام امام حسینؓ 166

حرفِ سپاس

دینے والے نے اپنی نعمتوں سے میری جھولی بھر دی، مشکلات تلخ تو تھیں مگر اُس کے کرم سے شیریں بن گئیں، زندگی کے جلتے سفر میں مجھے قدم قدم پر شجر ہائے سایہ دار ملتے رہے لیکن ایسے تجربات سے بھی گزرنا پڑا جو ادب اور شعر کو جنم دیتے ہیں چنانچہ شعر ہوتے رہے اور میں سپردِ قلم و قرطاس کرتا رہا۔ تازہ شعری مجموعہ ''بے بال و پر'' کے حوالے سے میری جس قدر حوصلہ افزائی ہوئی ہے اس کی مجھے توقع نہیں تھی، کس کے پاس وقت ہے کہ وہ کسی کا کلام پڑھے اور پھر اپنی گراں قدر رائے سے نوازے، ویسے ایسی نوازشات مجھ پر ہمیشہ ہوتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے تو میں سپاس گزار ہوں محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کا کہ جنہوں نے سب سے پہلے میرے شعری مجموعے ''بے بال و پر'' کو پڑھا اور اپنی رائے کا اظہار کیا، دراصل اِن سے ایک خاص تعلق بہت پہلے سے رہا ہے وہ ہمیشہ میری کاوشوں کی قدر کرتی رہی ہیں، انہوں نے اکادمی ادبیات پاکستان کے فورم سے شاہد بخاری ایڈووکیٹ کی کتاب ''پاکستانی ادب کے معمار'' پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال شخصیت اور فن'' کے حوالے سے ایک تقریب کا اہتمام کیا اور میری بے انتہا حوصلہ افزائی کی، ہمیں خوشی ہے کہ جب سے وہ اکادمی ادبیات کی چیئر پرسن تعینات ہوئی ہیں اکادمی ادبیات کے روز و شب بدل گئے ہیں، وہ علم و ادب کی بے پناہ خدمات سرانجام دے رہی ہیں اور ایسی تقریبات کا اہتمام کر رہی ہیں جن سے علم و ادب کے میدان میں ان کی بے انتہا دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔

میں ان احباب کا بھی ممنون ہوں جو مجھے یا تو جانتے نہیں تھے یا بہت کم جانتے تھے لیکن انہوں نے دل کھول کر اپنی محبتوں سے نوازا میں اولاً بالخصوص سراپا سپاس ہوں محترم پروفیسر فتح محمد ملک کا جن سے میں نے ٹیلی فون پر تعارف کرایا اور انہوں نے جس محبت و خلوص سے مجھے

نوازا ہے اس کے لئے میں ہمیشہ ان کا ممنون رہوں گا محترم ڈاکٹر اے بی اشرف نے شاید میرا کوئی مضمون ماہنامہ ''الحمرا'' میں پڑھا ہو تو پڑھا ہو، وہ مجھے بہت زیادہ نہیں جانتے تھے لیکن انہوں نے جس انداز سے میری حوصلہ افزائی کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے، بار بار ٹیلی فون پر اپنے پیغامات میں وہ میری تحریروں سے سرشار نظر آئے، مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اسی طرح محترم نذیر قیصر سے بھی میری کوئی شناسائی نہیں تھی، بس میں نے ٹیلی فون پر گفتگو کی اور اپنا کلام بھیج دیا انہوں نے بھی میرے کلام کو پڑھا اور اپنے گراں قدر خیالات تحریر کر بھیجے۔ میں بالخصوص سراپا سپاس ہوں محترم نسیم سحر کا کہ انہوں نے میرے کلام کا بغور مطالعہ کیا، مفید مشورے دیئے، ہمیشہ کی طرح میری رہنمائی کی اور بڑی تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ میں محترمہ پروفیسر ڈاکٹر فضیلت بانو کا بھی ممنون ہوں کہ برادرم شاہد بخاری نے جب ان سے میرا تعارف کرایا تو انہوں نے خوشی خوشی کلام کو پڑھا اور اپنی بیش قیمت رائے سے نوازا۔

میرے کرم فرماؤں کی تعداد اتنی ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا، ہر مرحلے پر محبت اور پیار کرنے والے احباب میں محترم حسن عسکری کاظمی، پروفیسر انور جمال، آصف مرزا اور امجد بٹ شامل ہیں، ان احباب نے اس سے قبل بھی مجھ پر کئی مضامین تحریر کئے اور میرے اس شعری مجموعے ''بے بال و پر'' کے حوالے سے بھی جس محبت و خلوص سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے میں اس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ برادرم آصف مرزا اور برادرم امجد بٹ نے تو اپنے جریدے ''دستک مری'' میں میرے حوالے سے نہایت محبت اور خلوص سے لبریز میری علمی ادبی کاوشوں کے حوالے سے نمبر شائع کیا تھا۔

میں ممنون ہوں اپنے دوست شاہد بخاری ایڈووکیٹ کا بھی جو ہمیشہ میرے ہم قدم رہتے ہیں اور میرے قابل اعتماد ہم سفر ہیں۔ میں ممنون ہوں برادرم سید نسیم الغنی اور تنویر احمد کا بھی کہ انہوں نے اس مجموعے کی اشاعت کے حوالے سے دن رات محنت کی اور اب یہ شعری مجموعہ اشاعت کے لئے تیار ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (تمغۂ امتیاز)

15۔ مارچ 2025ء

شیخ محمد اقبال کے بال و پر

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو خالقِ اکبر نے جہاں بینائی سے محروم رکھا وہاں علمی اور تخلیقی ژرف بینی سے شاد آباد رکھا۔ وہ جہاں اُردو، پنجابی اور انگریزی شاعری میں اپنے تخلیقی جوہر سے بڑے منفرد اور ممتاز انداز میں کام لیتے آئے ہیں وہاں نثر نگاری میں بھی اپنی ہنرمندی کا جادو جگاتے چلے آرہے ہیں۔ اُن کی شاعری کا زیرِ نظر تازہ ترین مجموعہ بعنوان ''بے بال و پر'' اُن کی نارسائیوں سے پھوٹا ہے:

یہ کس کی چیخ اُٹھی شب کے سینہ و دل سے
یہ کون چیخ اُٹھا شب کے آخری پل میں
عجیب چیخ میری روح کانپ کانپ اُٹھی
عجب پکار میرا دل دہل گیا جس سے
بدن پگھل سا گیا
یہ کس کی چیخ ہے جو آسماں کو چیر گئی
زمین کانپ اُٹھی چاند تارے ڈوب گئے
یہ چیخ اس کی نہ ہو جس کے گھر میں بھوک کا راج
وہ جس کے لختِ جگر بھوک بھوک کرتے ہوئے
نہ جانے رات کی بانہوں میں کھو گئے کس پل
یہ چیخ اس کی نہ ہو جس کی آنکھ بینا ہے
جس کا در و زندہ ہے
نہیں نہیں میرے مولا! یہ چیخ میری ہے
جو بہرے شہر میں ہرگز سنائی دیتی نہیں (آہِ نارسا)

پروفیسر محمد اقبال اپنے گرد و پیش کی زندگی کی مصوری اور ترجمانی کا حق ادا کرتے وقت دوسروں کے رنج والم کو یوں اپنا ذرد وغم بنا لیتے ہیں:

لوگ خوف کے مارے
تن میں سکڑے بیٹھے ہیں
من کے قید خانے میں
صبح ہوتی رہتی ہے
شام ہوتی رہتی ہے
دن گزرتے رہتے ہیں
عمر بیت جاتی ہے
خاک چاٹ لیتی ہے
وقت کے نوکیلے دانت
ہڈیاں چباتے ہیں
خاک خاک میں مل کر
خاک بنتی رہتی ہے
زیست اِک کہانی ہے
کیا عجب کہانی ہے (خوف کا آسیب)

اسی طرح ''شبِ تیرہ'' کی سی منظومات میں عوام کو درپیش مصائب ومشکلات سے نجات کی تمنا میں درج ذیل سوال اُٹھاتے ہیں:

رات کتنی لمبی ہے
رات کتنی بھاری ہے
اختتام کب ہوگا
ہم نہ ہوں گے ''تب'' ہوگا!
تب وہ کون دیکھے گا
یہ فقط خدا جانے

اور کوئی کیا جانے (شب تیرہ)

اسی طرح ہماری معاشرتی زندگی میں کذب و افترا کی فراوانی پر اپنے غم و اندوہ کا اظہار بڑے واشگاف انداز میں کرتے ہیں:

لوگ ہر گھڑی ہر پل
جھوٹ لکھتے رہتے ہیں
جھوٹ پڑھتے رہتے ہیں
جتنی بھی کتابیں ہیں
جھوٹ کا پلندہ ہیں
جھوٹ کی حکومت ہے
جھوٹ خوب بکتا ہے
جھوٹ خوب چلتا ہے
سچ تو اِک فسانہ ہے
سچ تو اِک کہانی ہے
بے مزہ، پرانی ہے
لوگ ہر گھڑی ہر پل
جھوٹ لکھتے رہتے ہیں (جھوٹ زندہ باد)

قومی زوال و انحطاط کی اِس روز افزوں فضا میں پروفیسر شیخ محمد اقبال کو علامہ محمد اقبال کا پیغام رہ رہ کر یاد آتا ہے:

میں سے میں ہوں میں سے تُو
میں سے ساری کائنات
میں سے میرے سر پہ پھیلا آسماں
میں سے میرے پاؤں کے نیچے زمیں
میں سے بحرِ بے کنار و بے حساب و بے حدود
میں سے پھیلا دشت تا حدِ نظر

میں سے دل کش دلنشیں شاموں کا حسن
میں سے صبح تا زہ دم تا زہ قدم
میں سے لمحوں کا سرورِ جاوداں
میں سے آنکھوں کا فروغِ مہر و ماہ فردوسِ گوش
میں نہیں تو زندگانی موت ہے
میں نہیں تو گلشنِ ہستی سراب
میں نہیں تو خامشی ہی خامشی
میں نہیں تو کوئی فردا ہے نہ دوش
میں نہیں تو بے مزہ ہر سوز و ساز
میں نہیں تو زندگی ہے بے لباس (خودی)

اپنے گرد و پیش کی دُنیا میں علامہ اقبال کے اِس فراموش کردہ پیغامِ خودی کو از سرِ نو زندہ اور سرگرمِ کار دیکھنے کی تمنا میں پروفیسر صاحب نے صرف شعر و سخن پر اکتفا نہیں کی، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ماہنامہ ''سفید چھڑی'' کے ذریعے اپنی اصلاحی سرگرمیاں تیز سے تیز کرنے میں منہمک ہیں۔ یوں اُن کا طرزِ فکر و نظر میرے، آپ اور ہم سب کے لیے سرچشمۂ فیضان ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک

(اسلام آباد)

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ''بے بال و پَر'' کی اُڑانیں

بہت مہربان، دردِ دل رکھنے والے اور تخلیقی لحاظ سے انتہائی زرخیز دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؔ سے میرا دوستانہ اور مخلصانہ قلبی تعلق کوئی دو چار برس کی بات نہیں، یہ نصف صدی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ کا قصہ ہے، ان کی کئی کتابوں پر اشاعت سے قبل دیباچے یا بعد از اشاعت مضمون اور تبصرے لکھنا میرے جیسے کم علم قلمکار کے لیے ایک ایسا اعزاز ہے جو بذاتِ خود کسی تمغے یا ایوارڈ سے کم نہیں۔ ان کی فلاحی اور سماجی بہبود کی سرگرمیاں ایک الگ مضمون کی متقاضی ہیں۔ ان کی تخلیقی، بہبودی اور سماجی سرگرمیوں کا اعتراف سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اتنی اعلیٰ سطحوں پر کیا جا سکا ہے کہ میرا ان کی شخصیت و فن پر کچھ کہنا سمندر میں ایک قطرے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

اب جو اُن کی کتاب ''بے بال و پَر'' کا مسودہ مجھے ملا تو میں نے بالاستیعاب اس کا مطالعہ کر کے عجیب سی نشاطیہ کیفیات سے بھرپور تسکین حاصل کی، ان کی تخلیقی زرخیزی کے تسلسل اور وسعت پر حیران بھی ہوا کہ جس عمر میں پہنچ کر لوگ اپنا ہی آموختہ دہرانے لگتے ہیں اس میں ڈاکٹر شیخ اقبال اتنے نئے نئے موضوعات کو کئی شعری اصناف میں کس قدر جدید انداز میں لکھ رہے ہیں۔ اس پر مجھے بے اختیار جناب احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر یاد آ گیا:

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نَو دیکھا ہے
فاصلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

تو گویا نصف صدی سے زائد ان سے شناسائی بھی ان کی ہر نئی شعری اور فکری تخلیق پر ان کے تخلیقی ''عالمِ نَو'' کے سلسلے کا ایک ایسا نیا منظر نامہ پیش کرنے لگتی ہے جسے دیکھ کر ان پر نہ صرف رشک آنے لگتا ہے بلکہ اپنی شناسائی پر تا حال ان کے مکمل ابلاغ نہ ہونے کا احساس بھی ہونے

لگتا ہے۔

اہلِ فکر و نظر کو خبر ہو کہ ان کا تازہ ترین شعری مجموعہ ''بے بال و پر'' موضوعات، اسلوب اور شعری اظہار کا ایک ایسا پیچو راما ہے جو ان کی سابقہ شعری توفیقات کا انفراد اور گہرائی کا عمق اور ارتقائی بلندیوں کی ارتفاعی ہمہ رنگی لیے ہوئے ہے۔ ان کی غزلیں ہوں، نظمیں ہوں، قطعات ہوں، ہائیکو ہوں یا مفرد اشعار، یہ سب ایک ایسی رسیلی زبان میں دانش اور وسعتِ خیال کے حامل ہیں جو قدیم و جدید شاعری میں کم کم پایا جاتا ہے۔ ذرا ایک نظر ماضی پر جایئے تو انہوں نے اپنے مسلسل ارتقائی اور تخلیقی سفر کا ذکر کرتے ہوئے کچھ یوں کہا تھا:

ابھی باقی ہے خُوئے دل نوازی
جوانی ہے ابھی بوڑھے شجر میں

بلا شبہ کئی برس پہلے کی یہی خوئے دل نوازی کی کیفیت عمر کے مزید ماہ و سال گزرنے کے بعد فزوں تر ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر شیخ اقبال کی تقدیسی شاعری میں تو عمر کے ساتھ ساتھ مزید عاجزی اور انکسار کے ساتھ ساتھ تقدیسی گہرائی پیدا ہو رہی ہے

جس کا کچھ اندازہ ان دو نعتیہ شعروں سے کیا جا سکتا ہے:

مرے سر پہ شوق کا سائباں، کڑی دھوپ ہے تو ہوا کرے
ہیں نظر میں طیبہ کے بام و در، کوئی چیز ہیں یہ مسافتیں

مرے سارے حرف تھے بے زباں، مری شاعری تھی فقط گماں
تیری مدحتوں کا کرم ہے سب، یہ فصاحتیں، یہ بلاغتیں

سلام امام حسین رضی اللہ تعالیٰ میں ان کی عقیدت کے ساتھ ساتھ حسینی پیغام اور فلسفے کو نظر انداز کرنے سے ہمارا احوالِ زاریوں بیان کرتے ہیں:

قافلۂ اُمید کا، کس کو بنائیں ہم امام
کیا عجیب بے بسی! ایک حسینؓ بھی نہیں

غزلوں میں بھی ان کا تقدیسی رنگ نمایاں ہے:

جو سہارا تھا اولیں اپنا
بس وہی آخری سہارا ہے

ہر ارتقا پسند شاعر جانتا ہے کہ نئی ردیفیں شعروں میں نئے معانی اور موضوعات کا در کھولتی ہیں، ڈاکٹر شیخ اقبال اس سلسلے میں بھی عمومی غزل گو شعراء سے کہیں آگے نظر آتے ہیں۔ وہ دو لفظی اور سہ لفظی ردائف تو استعمال کرتے ہی ہیں مگر اپنی شعری دُھن میں طویل تر ردائف بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور ان میں حیرت انگیز حد تک جدید موضوعات کی نیرنگی دکھاتے ہیں۔ عموماً شاعر کے لیے ایسی ردائف کو برتنا آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے کہ مصرعے میں ردیف زیادہ جگہ گھیر لیتی ہے جس کے سبب اس مصرعے اور اس شعر میں مضمون کی پوری طرح اور جمالیاتی زیبائش کے ساتھ ادائی مشکل ہو جاتی ہے، ڈاکٹر شیخ اقبال یہاں بھی اپنی شعری ہنرکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور ان کی طویل ردائف میں کہی گئی غزلیں بھی اپنا حسن اور موضوعاتی جہت برقرار رکھتی ہیں۔ پہلے ان کی مختصر دو لفظی یا طویل تر ردائف ملاحظہ ہوں: کا ارادہ تھا مگر، پھولوں کی محبت، رہنے دے، تو کیا ہوا، تھے تھے کبھی تو نہ تھی، اور کیا کرتا، رستہ بھول گیا، جھوٹ ہے، نے مار ڈالا، جا رہا ہے، خدا جانے۔ ان ردائف میں کئی اشعار اس قابل ہیں کہ یہاں شامل کیے جائیں مگر دیباچے کو غیر ضروری طوالت نہ دینے کے خیال سے ایسا نہیں کیا جا رہا۔

ان نسبتاً کم طویل ردائف کے بعد ذرا طویل ترین ردائف دیکھیے: میں بھولا تو نہیں تھا، دل بے چارہ ٹوٹ گیا، جاتے تو اچھا تھا، مجھے بھولا تو نہیں ہے، ہم نے سوچا تک نہ تھا، دیتے، ذرا تسکین ہو جاتی، ناں، کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ان ردائف میں سے کچھ اشعار ڈاکٹر شیخ اقبال کا کمالِ ہنرکاری دکھانے کے لیے یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

وہ وقت بھی آیا کہ مری جاں پہ بنی تھی
جیتا تھا نہ مرتا تھا، میں بھولا تو نہیں ہوں

مجھے معلوم تھا آنسو علاجِ غم نہیں لیکن
کچھ آنسو ہی بہا دیتے، ذرا تسکین ہو جاتی

وہ سیل کہ جس سیل میں اک میں ہی بچا تھا
وہ نوح کا طوفاں مجھے بھولا تو نہیں ہے

جو بیتی ہے، بھلا دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے
ذرا سا مسکرا دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے

سہلِ ممتنع میں ان کے کچھ اشعار نے تا دیر مجھے اپنی طرف متوجہ رکھا۔ ان کی سلاست اور روانی باکمال ہے

میں نے فی الفور اک غزل کہہ دی
جب کسی یاد نے پکارا ہے
بے اثر آہیں بے ثمر آنسو
زخم لگتے ہیں بھرتے رہتے ہیں
بے مزہ ہے داستاں تو کیا ہوا
آؤ جاناں، جینا مرنا سیکھ لیں
سانحہ اس سے بڑھ کے کیا ہو گا
روشنی تیرگی سے ہاری ہے
کیسے سچ بولوں کہ سچائی کی گنجائش نہیں
میں اکیلا کیا کروں، سارا زمانہ جھوٹ ہے
وہ جو کچھ بھی نہیں کرنے دیتا
دل سے وہ خار نکالا ہی نہیں

زندگی کے فلسفے کو کس عمدگی سے فطرت کے مظاہر سے منسلک کر کے بیان کرتے ہیں:

پھولوں کے نگر میں کوئی بوڑھا نہیں ہوتا
ہاں عمر بڑھا دیتی ہے پھولوں کی محبت
کیا ہے دریا کے بیچ اس کو ڈھونڈ
کیا ہے دریا کے پار، رہنے دے
آؤ پل پل میں تلاشیں اک صدی
وقت کم ہے میری جاں تو کیا ہوا

اپنی کبرسنی کے باوجود اپنے بارے میں مثبت انداز میں یوں لکھتے ہیں:

تھک بھی جاؤں تو نوجواں کر دے
وہ ارادہ جو نوجواں سا ہے

اپنی وسعتِ مطالعہ کا ثبوت یوں دیتے ہیں:

اہلِ یونان جھوٹ کہتے تھے
عشق کا کوئی دیوتا ہی نہیں

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بلا شبہ ان کے پیر و مرشد ہیں اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شاعری میں اُن کے پیغام کی جھلک اور رنگ واضح طور پر دکھائی دیتی ہے:

میں ہوں اقبال اور اقبالؒ میرے پیر و مرشد ہیں
خودی قربان کرنے سے تو یارو خودکشی اچھی
ہیں آج بھی نس نس میں رواں حضرتِ اقبال
رکھتے ہیں مجھے اب بھی جواں حضرتِ اقبال
اک ولولۂ تازہ ہر اک فرد کو بخشا
قوت کا، اخوت کا نشاں حضرتِ اقبال

ان کی شاعری میں جدت ایک ندرتِ اظہار کے ساتھ جلوہ افروز ہے:

آخری سین جانے کب آئے
درد و غم کا ڈرامہ جاری ہے
ہم ہیں ایک کونے میں، زندگی حویلی ہے
ہم کو کیا خبر کتنے ایکڑوں میں پھیلی ہے

اپنی تخلیقیت اور مسلسل نئے پن کے اسلوب برتنے کا انہیں خود بھی احساس و ادراک ہے اور وہ اس صفت کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں جس سے ان کی شاعری میں انفراد پیدا ہو رہا ہے:

میں نئے مزاج کا آدمی مجھے کچھ پرانا نہیں پسند
نئی سرزمیں کی تلاش ہے، نئے آسماں کی تلاش ہے
نت نئے بے ساختہ اشعار ہوتے جائیں گے
کچھ ہنر اور کچھ طبیعت شاعرانہ چاہیے

اس کے برعکس آج کل کی مروّج شاعری میں شعراء کے رجحانات پر یوں طنز بھی کرتے ہیں:

نہ جانے کتنے ہیں جو قافیوں سے کھیلتے ہیں
کسی کلام میں پر شاعری نہیں ملتی

اپنی نابینائی کے بارے میں انکا یہ شعر ان کی دروں بینی کی صلاحیت کی بڑے کمال کے ساتھ عکاسی کرتا ہے، جس کی گواہی اس مجموعے کے اشعار بہ زبانِ خود دے رہے ہیں:

آنکھ کیا خاک دیکھتی ہو گی
جو بِنا آنکھ دیکھتا ہوں میں

اپنے شعری مجموعے کے عنوان ''بے بال و پر'' کے حوالے سے ان کا یہ خوبصورت شعر بھی خیال انگیز ہے:

نہ جانے کب سے اڑتا جا رہا ہوں
مجھے تو بال و پر نے مار ڈالا

غالباً اسی کیفیت سے متاثر ہو کر انہوں نے اس مجموعے کا عنوان ''بے بال و پر'' رکھا ہے کہ بال و پر کے ساتھ اڑتے ہوئے تو تھک کر گرنے کا خطرہ ہوتا ہے مگر جو بے بال و پر ہی اڑتا جاتا ہو اسے کب فنا سے دوچار ہونا پڑتا ہے!

ڈاکٹر شیخ اقبال کی نظمیں ایک الگ کیفیت کی حامل ہیں، کہ وہ غزل اور نظم کے بنیادی فرق اور لفظیات سے بخوبی آگاہ ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں جو مضمون وہ دو مصرعے کے غزلیہ شعر میں ادا نہیں کر سکتے اسے عمدگی کے ساتھ نظم میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظم ''زندگی اے زندگی'' کی چند لائنیں دیکھیں جس میں انہوں نے بتدریج زندگی کو لطیفہ، کہانی یا ڈرامہ کہنے کے بعد آخری دو لائنوں میں پوری زندگی کا فلسفہ جامعیت کے ساتھ سمیٹ دیا ہے:

زندگی لطیفہ ہے / کیا عجب لطیفہ ہے /
ہنس کے رونا آتا ہے / رو کے ہنسنا آتا ہے / زندگی کہانی ہے /
جانے کب سے جاری ہے / جانے کب مکمل ہو! /
۔۔۔زندگی پہیلی ہو / یا کوئی لطیفہ ہو / یا کوئی کہانی ہو /

یا کوئی ڈرامہ ہو / پھر بھی ہم کو پیاری ہے / پھر بھی تم کو پیاری ہے

ان کی اکثر نظمیں ایسی ہی کیفیات کی ترجمان ہیں، مگر یہاں ان کے اقتباسات نہیں دیئے جا رہے کہ بعض نظمیں تو اس قابل ہیں کہ قارئین خود انہیں اول تا آخر پڑھیں تو ہی ان کا مکمل ابلاغ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر شیخ اقبال کی شاعری کی رنگا رنگی اور تخلیقی توفیقات پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن بقولِ شاعر 'مگر کہیں تو ہے قصہ تمام بھی کرنا'۔ چنانچہ میں ماضی قریب ہی میں اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی طرف سے شاہد بخاری کی مصنفہ ان کی شخصیت و فن پر شائع کی گئی کتاب کی اسلام آباد میں تقریبِ رونمائی کے موقع پر اپنے اظہاریے کو مختصر طور پر متعبس کرتے ہوئے یہ دیباچہ تمام کرتا ہوں کہ اس اظہاریے میں میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ آج بھی ان کے طویل تخلیقی سفر کے اعتراف کی بر ملا صداقت کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ یہ اظہاریہ تا حال کہیں شائع نہیں ہوا اس لیے اسے یہاں متعبس کرنا ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اگر کسی شاعر کے تازہ شعری مجموعے اور اس سے پہلے والے مجموعے میں ایک واضح ارتقائی عمل دکھائی نہ دے تو میں سمجھتا ہوں کہ تازہ شعری مجموعے کی اشاعت کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے اپنے ہر شعری مجموعے کی مزید توانا، پُر خیال اور نکھری ہوئی شاعری کے ذریعے اس کا جواز فراہم کر دیا ہے۔ بظاہر وہ بے حد آسانی سے شعر کہتے چلے جاتے ہیں مانو شعر کہنا اور سانس لینا ان کے لیے ایک ہی جیسی کیفیت ہو اور ایک ہی جیسا عمل ہو، مگر ان کے ہر شعر میں ان کا خون جلتا ہے تب کہیں ایک مصرعِ تر کی صورت نظر آتی ہے۔ ان کی زود گوئی کسی لحاظ سے منفی معنوں میں نہیں ہے۔ وہ مسلسل لکھ رہے ہیں، پہلے سے بہتر لکھ رہے ہیں، زبان و بیان پر تو انہیں شروع ہی سے قدرت حاصل ہے۔ ان کے وسیع مطالعے اور مسلسل غور و فکر کی عادت نے انہیں ایسے ایسے موضوعات پر بھی شعر کہنے کی توفیق دی ہے جس پر عام شاعر سوچتے بھی نہیں۔ ان کی شاعری میں اور خاص طور پر نظموں میں ہمارا واسطہ اُس شیخ محمد اقبال سے پڑتا ہے جو محض علامہ اقبال سے نہیں بلکہ دنیا بھر کے بہت سے دیگر دانشوروں، فلسفیوں اور شاعروں کا مطالعہ کر چکا ہے اور یوں اپنے فکری و تخلیقی کینوس میں بیکرانی کی حدوں کو چھوتا ہوا پھیلاؤ پیدا کر چکا ہے۔ تاہم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی پوری شاعری ان کے اپنے تخلیقی

اور علمی سرمائے کا نچوڑ ہے۔کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کی شاعری میں کیٹس، شیلی، جون ڈن، بائرن، ملٹن، شیکسپیئر یا علامہ اقبال ہم سے مخاطب ہیں۔

ان کا شعری اظہار ''شعر برائے شعر'' تک محدود نہیں ہے، ان کے پاس ابھی کہنے کو بہت کچھ ہے اور وہ یہ خزینہ قرطاس کے سپرد کر کے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔انہیں شہرت سے اب کوئی غرض نہیں کہ وہ جس قدر مشہور ہو چکے، ہو چکے۔اپنے مسلسل تخلیقی اظہار سے ان کا مقصد ادب کو مالا مال کرنا اور نئی نسل کو پیغام دینا ہے، اور اس پیغام کی ایک اہم تر جہت یہ بھی ہے کہ جس طرح بصارت سے محرومی کو انہوں نے محرومی نہیں بنایا بلکہ ایک جدوجہد اور مسلسل کاوش کا عنوان بنایا ہے، اسی طرح دیگر لوگوں کو بھی اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنالینا چاہیے۔ انہوں نے اپنی ایک محرومی کا ذکر بھی خداوندِ کریم سے صبر و شکر سے اور کسی شکوے کے بغیر کیا ہے، ایک ایسی محرومی جس کے عوض اللہ نے انہیں بہت کچھ دے کر اس کا ازالہ کر دیا ہے کہ اب عام بینائی رکھنے والوں کی بینائی تو تیرگی میں کام نہیں آتی مگر ان کے کام کس انداز میں آتی ہے، اس کا اظہار اس شعر میں ملاحظہ ہو:

مری آنکھوں کو وہ نظر بخشی
تیرگی میں بھی اُجالا نہ گیا''

چنانچہ درج بالا سطور میں ان کی بے پایاں قلمی وسعتوں کے ذکر سے اس کتاب کے قارئین پر بھی یہ واضح ہو جائے گا کہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ''بے بال و پر'' کی اُڑانیں بھی ایسی با کمال وسعتوں اور مرتفع رفعتوں پر ہیں جو بال و پر رکھنے والوں کی دسترس میں بھی نہیں۔میری دعائیں ان کی زندگی اور تخلیقی زندگی کے تسلسل اور وسعتِ اظہار کے لئے ہمیشہ سے رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔**وما علینا الا البلاغ**

نسیم سحر

(راولپنڈی)

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی دیدہ وری کا آئینہ

شاعری میں لہجہ اور انداز اظہار کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اردو شعر و سخن میں تخلیقی طرز احساس کے حوالے سے بہت سے نامور شاعروں میں ایک نام شیخ محمد اقبال ہماری توجہ کا مرکز و محور بن جاتا ہے، تعلیم و تدریس، تحقیق و تنقید اور علمی و ادبی مصروفیات کے باوصف وہ غزل اور نظم میں اپنی انفرادیت بحال رکھنے میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنا لہجہ اور انداز نظر اپنی شناخت بنا کر ایسا راستہ اختیار کیا جس پر وہ نہ صرف قائم رہے بلکہ اپنی تخلیقی ہنرمندی کا لوہا منوا کر رہے، نثری اور شعری تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی دیدہ وری اور بصیرت کا حسن قاری کو ہر طرح سے نہال کر دیتا ہے۔ ان کی مصروفیات پر نظر جاتی ہے تو وہ بیک وقت کئی محاذوں پر سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔

فی الوقت ان کی تازہ تخلیق مجموعۂ شاعری ''بے بال و پر'' میں ان کے ذوقِ پرواز اور رفعتِ خیال کا جائزہ لینا مقصود نظر ہے اس لئے نظم و غزل کے حسین امتزاج کا یہ شاہکار ایک گلستۂ حرف و معنی مشامِ جاں کو معطر کر رہا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی عمومی طور طریقوں سے مختلف ہو وہ کیسے اپنے آفاق سے باخبر ہے۔ ڈاکٹر شیخ اقبال نے زندگی گزاری یا زندگی نے شیخ اقبال کو گزارا۔ وہ خود لمحۂ گریزاں کا تجزیہ کرتے ہیں کہ

زندگی لطیفہ ہے
کیا عجب لطیفہ ہے
ہنس کے رونا آتا ہے
رو کے ہنسنا آتا ہے
زندگی کہانی ہے

جانے کب سے جاری ہے
جانے کب مکمل ہو

ان کی اس نظم کی چند سطریں پڑھ کر فکر و خیال کی دنیا کا ورق ہماری نگاہوں کے روبرو کھل جاتا ہے کہ زندگی پہیلی ہے / کون بوجھ سکتا ہے

ان کی ہر نظم میں تفہیم زندگی اور ادراک ذہانت کا پرتو آب و تاب کے ساتھ جلوہ فرما ہوتا ہے اور ہم شیخ اقبال کی فکری گیرائی اور گہرائی سے اپنی بساط کے مطابق آگہی حاصل کرتے ہیں۔اس مجموعۂ شاعری میں غزل کا معیار اُن کے تخیل سے ہم آہنگ ہے، بیشتر غزلیں روایت کی آئینہ دار ہیں وہ اپنے ماضی کو یاد رکھنا فرض جانتے ہیں اس لئے محرومیوں کا ذکر نہ آئے یہ ممکن نہیں مگر اس کے باوصف ان کی غزل میں رجائیت غالب ہے۔

زندگی اتنی دردِ سر تو نہ تھی
شاخِ جاں اتنی بے ثمر تو نہ تھی

.....

ہم نے ہر بت کو رائی کر دیا
کوئی بتلائے کہ ہارے تھے کبھی

.....

میرے دل میں تمنا جاگتی ہے
یہی تو بس ثبوتِ زندگی ہے

.....

ہم نے تو صرف محبت کی ہے
عشق کے روگ کو پالا ہی نہیں
زیست فیاض بہت تھی لیکن
میں تجھے پا کے دعا کیا کرتا

شیخ محمد اقبال اول و آخر ایسے شاعر ہیں، جو دل کا کہا مانتے ضرور ہیں مگر وہی کرتے ہیں جو وہ خود چاہتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ وہ محبت کرتے ہیں عشق سے گریزاں ہیں۔وہ ہماری طرح اسی دنیا میں رہتے ہیں مگر ان کی اور دنیا بھی ہے جس تک ہماری رسائی نہیں۔وہ ایسے

اجالوں میں رہتے ہیں جسے ہم جیسے چشم ظاہر رکھنے والے کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔ شیخ محمد اقبال کی شعر و سخن میں ثروت مندی اپنی مثال آپ ہے ان کا یہ کہنا

دل میں کیا کچھ ہے جانے کہنے کو
کب ملے گی زباں خدا جانے

.....

میں کیوں نہ کروں پیار حسیناؤں سے اقبالؔ
ہے حسن صداقت میرا ایماں نہیں کیا!

.....

ریزہ ریزہ کر ڈالا ہم بتاؤ کیا کرتے
خواہشوں کا لشکر ہے ایک جاں اکیلی ہے

آخر میں شیخ محمد اقبال کی ہمہ جہت تخلیقات کے حوالے سے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مقصد حیات کو پا لیا اور زندہ رہنے کی یہ سبیل ہے کہ ان کے حرف تخلیق کی صورت وہ حسن معنوی ہے جو آنے والے زمانوں میں ان کے ہر گوشۂ زندگی کا غماز ہوگا۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

شیخ محمد اقبال ''تمغۂ امتیاز''

زندگی کے بیستوں کا مہم جُو

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو، یا درمیاں رہے

فطرت کے بارے میں ہمارے بیشتر دانا و بینا لوگوں کی یہ رائے ہے کہ فطرت بے رحم مظہر ہے جو یہ نہیں دیکھتی کہ کون اجڑ گیا اور کس کے چشم و دل و جگر کی دنیا تاراج ہوئی۔ ہمارے Determinist فلاسفہ کا تو یہی خیال ہے لیکن جب میں شیخ محمد اقبال کا Profile دیکھتا ہوں تو مجھے فطرت شفیق ماں کی گود محسوس ہوتی ہے۔ جو بہترین Compensater ہے۔ ایک حاسہ چھن جائے تو عنایات و اکرامات کی بارش کر دیتی ہے، تاریخِ ادب و فنون میں ایسے باکمال اور صاحبانِ بصیرت گزرے ہیں جن کی زندگی چشمِ بینا رکھنے والوں کے لئے قابلِ رشک، حیرت کدہ ہے، ایلیڈ اور اوڈیسی جیسے Epics کے خالق ہومر، ۔۔۔عرب کے فلسفی شاعر غفران و لزومات کے مصنف ابوالعلا معری اور دنیا بھر کے بلائنڈ کے لئے بریل سسٹم ایجاد کرنے والے لوئی بریل اور ہیلن کیلر واضح اور نمایاں مثالیں ہیں۔ میں پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال کو اسی فہرست میں شامل کرتا ہوں، کم عمری میں چشمِ بصارت کا نور چھن جانے کے بعد انہیں ایک دلِ بینا عطا کر دیا گیا جس کی طلب کا مشورہ علامہ اقبال نے دیا ہے۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اردو اور انگریزی ادبیات میں ماسٹر، ایم فل میں گولڈ میڈل،

Impact of British Poets Over Iqbal جیسے دقت طلب موضوع پر پی ایچ ڈی کیا۔ پاکستان کے پہلے بلائنڈ جس نے ایم اے انگریزی کیا اور انگریزی ادبیات کے پہلے بلائنڈ لیکچرر بننے کا اعزاز، اردو، فارسی، انگریزی، پنجابی زبانوں میں دو درجن کتب تصنیف کیں۔ دس کے قریب شعری مجموعے، دنیا بھر کے بلائنڈ کی فلاح و بہبود اور تعلیم کے لئے ادارے کا قیام، سفید چھڑی کے نام سے ایک ادبی پرچہ کئی سالوں سے ان کی ادارت میں چھپ رہا ہے، یہ ہیں ان کے چیدہ چیدہ کارنامے جو ان کے کریڈٹ میں ہیں گویا وہ زندگی کے بیستوں کا ایسا مہم جُو ہے جو جُوئے شیر لانے کے لئے شب و روز خونِ جگر جلا رہا ہے۔

اب وہ ''بے بال و پر'' کے نام سے اپنا تازہ شعری مجموعہ لائے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا کافی عرصے سے قاری اور مداح ہوں۔ ان کی شاعری زندگی کی تلخ و شیریں سچائیوں کا تخلیقی اظہار ہے شاعری کے نظریے کے اعتبار سے وہ اس بات کے قائل نہیں کہ شعری منطق کے بغیر محض ردیف، قافیے جوڑ کر بے معنی شاعری کی جائے۔ وہ واقعے، سانحے، المیے اور وارداتِ دل کو تخلیق کی آنچ پر سجے، سجے پکا کر قاری کے سامنے لاتے ہیں، یہ وہ کرب اظہار ہے جہاں شاعری محض کارِ بے کاراں نہیں رہتی، بلکہ فرد اور معاشرے کے بطون سے پھوٹنے والی بامعنی اور مسرت آفریں روشنی بن جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا بڑا کینوس زمان و مکان کی قید سے آزاد محبت کی فراوانی کا کینوس ہے کیونکہ وہ زندگی کی معنویت کو سطح دریا سے دیکھ کر رائے قائم نہیں کرتے، بلکہ تہہ میں غوطہ زنی کر کے گوہرِ حیات کو تلاش کر لاتے ہیں۔

پروفیسر انور جمال

(ملتان)

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایک ہمہ جہت شخصیت

شیخ محمد اقبال ایک معروف علمی و ادبی شخصیت ہیں ان کی کامیابیوں کی فہرست بہت طویل ہے، نظم و نثر میں ان کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں، وہ بھارت کے علاقے مشرقی پنجاب کے شہر کرنال میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلیمی و ادبی سفر مشکلات کے باوجود نہایت شاندار اور کامیابیوں کا سفر ہے، وہ پاکستان کے پہلے ایسے باہمت اور مستقل مزاج انسانوں میں سے ایک ہیں جو اندھیروں میں روشنی کے اجالے بکھیرتے اور دوسروں کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ان بہادر انسانوں میں سب سے آگے ہیں جو مصائب و مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتے اور ہر طرح کی مشکلات کی پرواہ کئے بغیر اعزازات، تخلیقات اور کامرانیوں کے سفر کو منزلوں سے ہمکنار کرتے ہیں بچپن میں ہی آنکھوں کی روشنی سے محروم ہونے کے باوجود وہ آگے بڑھنے والوں کے لئے مینارۂ نور ہیں انہوں نے ایم اے انگریزی بڑے اعزاز سے پاس کیا۔ ادب و فن کی شاندار خدمات کے ساتھ ساتھ پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ کے صدر اور عوامی فلاح و بہبود کے تشنہ لبوں کے لئے بحرِ بے کنار ہیں، ایم فل میں گولڈ میڈل اور پی ایچ ڈی کی اعلیٰ تعلیمی ڈگری کے حاصل کرنے والے ہیں اور تعلیمی قافلوں کے سپہ سالار ہیں، ان کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں ان کی علم و ادب کی کاوشوں اور جدوجہد کی داستان کا خوبصورت عنوان ہیں، وہ تدریس جیسے پیغمبری پیشے سے منسلک ہو کر جہالت کی تاریکیوں میں گرنے والوں اور کم ہمتی سے بیٹھ جانے والوں کے لئے ہمت اور جرأت کی ایک روشن مثال ہیں۔ شیخ محمد اقبال اپنی گوناں گوں خوبیوں کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے ایک ہمہ جہت ادیب اور شاعر بھی ہیں۔

ان کی شاعری کی پہلی تصنیف ''ساحلِ تشنہ لب'' 1982 میں شائع ہوئی۔ اب تک ان کی

شاعری کی ۱۰ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جو علمی و ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

شیخ محمد اقبال نے اپنی سوچ اور خیال کو زندگی اور حالات کی مایوسیوں کا شکار نہیں ہونے دیا اپنے جذبات اور احساسات کو کتابوں کی صورت میں محفوظ کر کے الفاظ کا ایک خوبصورت دبستان سجا دیا ہے۔ان کی زیرِ نظر تصنیف ''بے بال و پر'' شاعری کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے یہ غزلوں اور نظموں کا ایک دلکش مرقع ہے جس میں انہوں نے زندگی اور معاشرے کی سچائیوں اور تلخیوں کو بڑی خوبصورتی اور سادگی سے بیان کیا ہے۔وہ ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے ایک خوبصورت انسان ہیں انہوں نے اپنے باطن کی خوبصورتی کو شاعری کے روپ میں بڑی سادگی اور سچائی سے بیان کیا ہے اور یہی ان کا منفرد انداز اور اسلوب ہے، اردو کی روایتی اور مقصدی شاعری کے تمام لوازم ہمیں شیخ محمد اقبال کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔بعض اشعار میں ان کے ذاتی تجربات اور احساسات کا رنگ بہت نمایاں ہے، بہت سادگی سے انہوں نے حقیقت اور سچائی کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں:

جرأت کی بات کی مگر جرأت نہ کر سکا
میں اپنی خواہشوں کی قیادت نہ کر سکا
بے التفاتیاں بھی مجھے پیار ہی لگیں
میں اپنے دوستوں کی شکایت نہ کر سکا

وہ انسانی رشتوں اور محبت کو انفرادی یا ذاتی تعلق نہیں بلکہ اظہارِ ذات اور بنی نوع انسان کا ایک ہمہ گیر تسلسل اور رشتہ گردانتے ہیں ان کے ہاں محبت و پیار کی شرینی کا احساس ہوتا ہے۔شیخ محمد اقبال اعلیٰ انسانی قدروں کے نقیب ہیں یہی ان کی شاعری کی انفرادیت ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کا یہ شعری سفر ہمیشہ جاری و ساری رہے، وہ جذبات و احساسات کو لفظوں کے ہار کی صورت پروتے رہیں، خوش رہیں آباد رہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر فضیلت بانو
منہاج یونیورسٹی لاہور

''بے بال و پَر'' کی بلند پروازیاں

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پر قلم اٹھایا جائے اور محترم شاہد بخاری کا ذکر نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں جن کا کہنا ہے کہ ''ڈاکٹر پروفیسر اقبال کو میں نہ جانے کب سے جانتا ہوں، شاید اُس وقت سے جب سے ہم خود ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔''

مُشفقِ من شاہد بخاری صاحب کی جانب سے تفصیلی تعارف ہی ان کی شخصیت پر دستک کی خصوصی اشاعت کا سبب بنا تھا، جو مری سے شائع ہونے والے اس پہلے مجلّے کی بیس سالہ تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔ یہ بات بھی آج سے کم و بیش دو عشرے قبل کی ہے۔ تب تک ڈاکٹر صاحب کی نظم و نثر اور تنقید پر مبنی پندرہ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔ آج یہ تعداد پچیس سے تجاوز کر چکی ہے اور پروفیسر صاحب کا سرسبز و شاداب قلم اُسی آب و تاب کے ساتھ رواں دواں ہے، اور کہیں رُکے بغیر حرف و معانی کے گراں قدر گُل زار مہکائے چلا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اقبال صاحب اتنی جامع الحیثیات اور بھرپور شخصیت ہیں کہ اُن کی زندگی کا ہر پہلو اپنے اظہار کے لیے ایک الگ مضمون یا کتاب کا متقاضی ہے۔ آپ ایک استاذ، دانشور، شاعر، ادیب، مقرر، مترجم، ماہرِ لسانیات، ماہرِ اقبالیات اور موسیقار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دردمند مصلح اور انسان دوست سماجی کارکن بھی ہیں۔ تاہم اب جو بات میں کرنے جا رہا ہوں وہ قدرے مختلف ہے۔ نظم و نثر کی یکجائی آپ کو دیگر شخصیات میں بھی ملے گی، جیسے جناب احمد ندیم قاسمی، جناب ڈاکٹر وزیر آغا۔ کہیں کہیں شعر و ادب کے ساتھ آپ کو موسیقی اور اداکاری کے رنگ بھی مل جائیں گے، جیسے جناب شاہد احمد دہلوی، جناب افضل پرویز اور جناب انور سجاد۔ تاہم آپ کو شعر و ادب اور موسیقی و مُدرّسی کے ہمراہ مخلوقِ خدا کی فلاح و بہبود اور انسان دوستی کے عنوان سے عملی کوششوں اور سرگرمیوں کی یکجائی شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ تادمِ تحریر کوئی دوسری مثال

میرے علم میں نہیں آئی۔ اور باقی ساری چیزوں کے ساتھ یہ انسان دوستی اور دردمندی محض برائے شعر گفتن نہیں، ان کی زندگی ہے، قال نہیں حال ہے، اور ان سے اِس انداز کے شعر کہلواتا ہے؛

بے نواؤں کا جو سہارا ہے
وہ محبت کا استعارہ ہے
جو زمینوں پہ پھول بوتا ہے
آسمانوں پہ چاند تارہ ہے
ہم سبھی ایک گھر میں رہتے ہیں
کیا ہمارا ہے کیا تمہارا ہے

سبھی اہلِ محلّہ ایک گھر کے فرد لگتے ہیں
مرا چھوٹا سا کچا گھر مری تنگ سی گلی اچھی

انسانی دُکھ درد پر گریہ کناں دو شعر اور دیکھیے؛

دردِ انساں اور اپنی مختصر سی زندگی
دردِ انساں کے بیاں کو اک زمانہ چاہیے

ترے ہر کام میں ہے مصلحت پر تیری دنیا میں
کوئی بھوکا کوئی بے گھر ذرا اچھا نہیں لگتا

ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال کے سفرِ شعر کا آغاز، انیس سو بیاسی کے آس پاس ''ساحلِ تشنہ لب'' سے ہوتا ہے اور ''سوالیہ نشان''، ''اک ہمسفر اچھا لگا''، ''تلاوتِ دل''، ''یہ کافر دل نہیں مانا''، ''اُس کے نام''، ''ابھی زندگی کا جواز ہے''، ''کس کی یاد آ گئی'' سے ہوتا ہوا ''بے بال و پر'' کے اگلے پڑاؤ تک آ پہنچا ہے اور سفر تا حال جاری ہے۔ یاد رہے کہ ایک پنجابی اور انگریزی مجموعہ کلام اس کے علاوہ ہے۔ نعت سے شروع ہونے والے اس تازہ شعری مجموعے میں ستاون غزلیں، بائیس نظمیں، ایک سلام، آٹھ ہائیکو، تین قطعات اور تیرہ مفرد اشعار شامل ہیں۔ اس سے یہ بھی بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا رہوارِ قلم، مختلف اصنافِ سخن میں مسلسل

اپنے تخلیقی جواہر بکھیرتا چلا جا رہا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا وڑا ک ذہن لمحہ بہ لمحہ رُو بہ ترقی اپنے عصری شعور کو کیسے اپنی شاعری میں سمو دینے کے ہنر سے نبرد آزما ہے۔ کیسے کیسے گُل بُوٹے تراش رہا ہے اور کہیں بھی، کسی بھی مقام پر رُکے بغیر آگے اور آگے بڑھنے کا عندیہ دے رہا ہے۔

میں اب بھی کر رہا ہوں نئی بستیاں تلاش
پاؤں میں اب بھی تاب و تواں اس قدر تو ہے
میں لے رہا ہوں سانس بڑے طمطراق سے
موجود میری راکھ میں کوئی شرر تو ہے
ماضی کی دار و گیر سے باہر نکل کے چل
اِک کل گزر گیا ہے مگر ایک کل تو ہے

.....

ہم کو اپنے قلب و جاں کو آزمانا چاہیے
نت نئی دھرتی نیا گردُوں بنانا چاہیے

.....

ہارا ہوں میں سو بار مگر دل نہیں ہارا
یہ سعیِ مسلسل ہے مِری ہار کہاں ہے

.....

کیا غم ہے دوڑ دھوپ میں دل تو لگا رہا
گر بھی گیا تو پھر سے اُٹھا اور چل پڑا
ذوقِ فضول نے بھریں رگ رگ میں بجلیاں
اُڑنے کا شوق تھا مجھے بے بال و پر اُڑا

اور مسلسل آگے بڑھتے رہنے کے سفر میں اُن کی جولانیِ طبع اُن سے کیسے جوان العمر شعر کہلواتی ہے؛

دل ہُوا مہرباں دیکھتے دیکھتے
ہو گیا میں جواں دیکھتے دیکھتے

پھولوں کے نگر میں کوئی بُوڑھا نہیں ہوتا
پھولوں سا بنا دیتی ہے پھولوں کی محبت
تپتے ہوئے صحرا ہوں کہ جلتے ہوئے جنگل
گُل زار بنا دیتی ہے پھولوں کی محبت

ڈاکٹر صاحب کی جمال پرور شاعری کا ایک نمایاں اور دلنواز رنگ سہل ممتنع ہے، جس میں کلاسیکی رچاؤ بھی اپنی چھب دکھاتا ہے۔ زندگی کے مختلف رنگوں اور پہلوؤں کو ایک ہی غزل کے اندر ملاحظہ فرمایئے اور سُبک رفتار رندی کی لہروں پر ڈولتی کشتی میں بیٹھے ہوئے ایک مترنم بہاؤ کی کیفیات سے لطف و انبساط کشید کیجیے؛

آنکھ کو اشکبار رہنے دے
کوئی تو غمگسار رہنے دے
فکر و فن کی شگفتگی کے لیے
دل کو کچھ بے قرار رہنے دے
کھیل رکھ صرف کھیل تک محدود
کھیل میں جیت ہار رہنے دے
جیسے گزریں گزار دے راتیں
صبح کا انتظار رہنے دے
زخم ہائے حیات سہنا سیکھ
درد کو خوش گوار رہنے دے
جو ہے دریا کے بیچ اس کو ڈھونڈ
کیا ہے دریا کے پار رہنے دے
یہ ادائیں تری ضرورت ہیں
ہے تجھے مجھ سے پیار رہنے دے
عشق کے نام پر دلوں سے نہ کھیل
اب تو یہ کاروبار رہنے دے

ڈاکٹر صاحب اپنی شاعری میں بالعموم بڑی منفرد، متنوع اور گنگناتی بحروں میں طویل ردیفوں کا استعمال زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور بڑے سلیقے، قرینے اور مہارت کے ساتھ مت نئے معانی کشید کرتے ہیں، جن سے اُن کے فلسفۂ شعر کی نہ صرف ترجمانی ہوتی ہے بلکہ شعری کینوس بھی وسیع تر رہتا ہے؛

میں دستِ غیب میں ہوں اِک کھلونا، برابر ہے مرا ہونا نہ ہونا
کبھی جوڑا کبھی توڑا گیا ہوں ، مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے

ایک شعر چھوٹی بحر میں دیکھیے:

وہ جس کا لمحہ لمحہ زندگی ہے
وہ دن لمحوں میں ڈھلتا جا رہا ہے

آؤ پل پل میں تلاشیں اک صدی
وقت کم ہے میری جاں تو کیا ہُوا

ایک غم دیدہ خود کلامی اور سرگوشی کے سے انداز میں کہے گئے یہ فکر پرور اشعار دیکھیں؛

وقت کی سیڑھیاں ہیں بے منزل
لوگ چڑھتے اُترتے رہتے ہیں
خوف احساس، خوف ہے جس سے
ہم شب و روز ڈرتے رہتے ہیں
بے اثر آہیں بے ثمر آنسو
زخم گنتے ہیں بھرتے رہتے ہیں
خود سے کرتے ہیں سینکڑوں باتیں
اور خود ہی مُکرتے رہتے ہیں

ایک تقریب ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی، راقم السطور کو حُسنِ اتفاق سے اُن کے قریب بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں بغرض مشاہدہ، موقع بہ موقع اُنہیں دیکھتا رہا، اور اِس دوران میں یہ قطعی فراموش کر چکا تھا کہ وہ کوئی ظاہری بینائی سے محروم شخصیت ہیں۔ میں

نے ڈاکٹر صاحب ہی کا ایک زندہ اور غیر معمولی شعر اُن کے سراپے سے صادر ہوتا دیکھا۔ اُن کے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانک رہی تھی۔ اور ایسا اِس لیے تھا کہ اُنہوں نے محرومِ بینائی ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی کو خود پر ترس کھانے کا موقع نہیں دیا۔ پروفیسر صاحب، خُدائی مصلحتوں کے تحت معذور کیے گئے انسانوں کے اُس اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو خود کو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ اپنے دائرہ کار کو وسیع تر کرتے ہوئے پورے انسانی معاشرے کو اپنی جولاں گاہ بناتے ہیں۔ آٹھ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ڈاکٹر صاحب اپنی بصارتِ ظاہری سے یکسر محروم ہو چکے تھے۔ تلافیِ مافات کے طور پر مبداء فیاض کی جانب سے جو بصیرتِ باطنی آپ کو عطا ہوئی، اُس کے نتیجے کے طور پر آپ کے محسوسات کی دنیا میں ایک خاص طرح کی تیز فہمی اور ذکاوت آ گئی اور دیگر حسیات کے خلّاقانہ استعمال پر قدرت نے آپ کو ایسی دسترس عطا کی، جس کے آثار و اثرات، جا بجا آپ کی شاعری اور زندگی میں اپنی جھلکیاں دکھاتے نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ابتدائے عہدِ طفولیت کا مشاہدہ، کیسے آپ کی فکر، سوچ اور تخیل میں گُندھ کر، کم و بیش اَسّی برس کی عمر میں بھی آپ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

مجھے ڈاکٹر پروفیسر شیخ اقبال صاحب کے لیے کہی گئی ڈاکٹر نثار ترابی کی ایک نکتہ رس اور لطیف بات بہت پسند آئی تھی، موقع کی مناسبت سے آپ کو یاد دلاتا چلوں۔ ''شیخ اقبال صاحب کی شخصیت اور فکری و فنی جولانیوں کی عطا یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی سوچ اور روّیے کو ہمیشہ صبر و شکر کے تقدس مآب حصار میں رکھا ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ ظاہری بصارت کی بجائے باطنی پہلوؤں کو مقدم جانا ہے۔''

آپ کو درج بالا خیالات کی توثیق و تصدیق کرتی، زیرِ نظر شعری صحیفے ''بے بال و پر'' کی ایک بال و پر سے آراستہ غزل کے چند اشعار سناتے ہیں؛

کیا حُسن انوکھا تھا میں بھولا تو نہیں ہوں
ہر سمت اُجالا تھا میں بھولا تو نہیں ہوں

جس نے مرے الفاظ کو بینائی عطا کی
اک چاند تھا تارہ تھا میں بھولا تو نہیں ہوں
اک شب تھی جو قند کاٹھ میں صدیوں سے بڑی تھی
دن کس طرح نکلا تھا میں بھولا تو نہیں ہوں
کس دھج سے نکلتا تھا ہر اک دن مرے گھر میں
کس شان سے ڈھلتا تھا میں بھولا تو نہیں ہوں
منزل تھی نہ رستہ تھا، قدم آگے ہی آگے
اک شوق چلاتا تھا میں بھولا تو نہیں ہوں

''بے بال و پر'' میں ایک شعر ہے:

میں ہوں اقبال اور اقبال میرے پیر و مُرشد ہیں
خودی قربان کرنے سے تو یارو خودکشی اچھی

علامہ اقبال کو پیر و مُرشد کہنے والے ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال نے علامہ اقبال سے ہم نامی کے حُسنِ اتفاق کو جس محنت، لگن اور مستقل مزاجی سے ذاتی شرف و شہرت میں ڈھالا ہے، وہ بھی ایک بے مثال بات ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں؛

بے محبت پیہم کوئی جوہر نہیں کُھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کو اپنی ایک نظم میں بڑے محبت آمیز لہجے میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، تین اشعار آپ کو سنانا چاہتا ہوں؛

ہے آج بھی نس نس میں رواں حضرتِ اقبالؒ
رکھتے ہیں مجھے اب بھی جواں حضرتِ اقبالؒ
میں اُن کے تفکر کے پنگھوڑے میں پلا ہوں
ہے میرا مکاں، میرا جہاں حضرتِ اقبالؒ
اس نام سے ہم ایسوں نے بس نام کمایا
ہم ایسے کہاں اور کہاں حضرتِ اقبالؒ

ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال کی اب تک کی تمام شاعری کے تناظر میں ''بے بال و پر'' کو دیکھا جائے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ آپ کے شعروں کی شعلگی نہ صرف قائم و دائم ہے بلکہ اُن کی تب و تاب اور اثر انگیزی میں مزید وسعت اور گہرائی در آئی ہے۔ رہی بات کلام میں تکرارِ خیال کی یا گاہے گاہے کچھ باتوں کو دہرائے جانے کی، تو اس باب میں خود ڈاکٹر شیخ اقبال نے اتنی جامع اور معنی خیز بات کہہ رکھی ہے جسے یہاں بیان کرنا شاید غیر ضروری نہ سمجھا جائے۔

''مجھے معلوم ہے میرے شعری ارتقا کی کیا صورت رہی ہے، کبھی کبھی مجھے یہ خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ میں اپنے آپ کو دُہرا تو تو نہیں رہا لیکن اگر دُہرا بھی رہا ہوں تو قصور میرے احساساتی وفور کا ہے اور جذباتی گہرائی اور گیرائی کا ہے۔ ہم روزانہ خود کو دُہراتے ہیں، لیکن اگلا دن گزشتہ دن سے زیادہ فعال ہو تو خیر ہے۔''

کئی شعروں میں باندھا اور کئی مضمون لکھ ڈالے
کتابِ زندگی میں بات جو ہم کو لگی اچھی

ڈاکٹر صاحب کے چند منتخب اشعار، بغیر تبصرے کے پیش ہیں اس خواہش اور دعا کے ساتھ کہ آپ اِسی طرح مضامین تازہ کے انبار لگائے رکھیں؛

جو مُڑ کے دیکھا تو پتھر میں ڈھل گیا ہوں میں
لگا تھا ایسے کہ آواز دے رہا ہے کوئی
آنکھ کیا خاک دیکھتی ہو گی
جو بِنا آنکھ دیکھتا ہوں میں

.....

فلسفہ و حکمت نے ہار مان لی آخر
زندگی پہیلی تھی زندگی پہیلی ہے

.....

لاش کے گِرد تماشائی ہیں
کوئی شیون کوئی نالہ ہی نہیں

.....

اک عجب درد ہے سونے نہیں دیتا مجھ کو
پر یہ معلوم نہیں درد کہاں ہوتا ہے

ہر مکاں کے لیے لازم ہے مکینوں کا وجود
بھوت آ بستے ہیں جب خالی مکاں ہوتا ہے

علم کی اصل جہل و نادانی
ہر خبر اب تو بے خبر سی ہے

اُسی مکان میں کٹتے ہیں روز و شب میرے
وہ جس مکاں کا کوئی دُور تک نشاں بھی نہیں

محمد آصف مرزا

(مری)

علامہ اِقبال کا دِیدہ ور

آپ بلا جھجک ڈاکٹر پروفیسر شیخ مُحمد اِقبال کو علامہ اِقبال کا دِیدہ ور کہہ سکتے ہیں۔ خاکسار کی رائے کے مُطابق پچیس کروڑ کے اِس جمِ غفیر میں ایک فرد بھی ایسا نہیں جس نے بِینائی سے محرُومی کو اپنی طاقت بنا کر نہ صرف ایم اے انگریزی کیا بلکہ وطنِ عزیز کے پہلے نابینا انگریزی پروفیسر کی حیثیت سے طلباء و طالبات کی لِسانی و ادبی بصارتوں اور بصیرتوں کو مُنوّر کیا۔ یہی نہیں اپنے مادرِ وطن کے اوّلین بصارت سے محرُوم ایم فِل اور پی ایچ ڈی سکالر کا اعزاز بھی موصُوف ہی کو حاصل ہے۔ یہ تمام اعزازات اُن محرُومیوں کا ردِعمل ہیں جنہوں نے بچپن سے اب تک ڈاکٹر صاحب کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

جس گھر میں ایک نابینا بچے کے والدین کو قریبی رِشتے دار یہ طعنے دیتے ہوں کہ ''ماں باپ کے گُناہوں کی سزا معصُوم بچوں کو مِل رہی ہے''، ''اِس گھر میں تو اپنے بچوں کو کھیلنے کے لئے ہر گز نہ بھیجا جائے''، ''اب یہ اندھا بچہ بھیک مانگ کر اپنا گُزارہ کرے گا؟'' خُوشاب کے بچوں کا معذُوروں پر تالیاں بجانے اور تمسخر اُڑانے کا وطیرہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے بچپن میں دوست بھی اِن سے کترانا شُروع ہو گئے تھے، اور جب ڈاکٹر صاحب کے دادا جان (غُلام نبی) اِن کے والد (اللہ دِیا) کو دیکھتے ہی کہہ ڈالتے ''دیکھا تُمہاری کرنی آگے آئی'' یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کے والدین بھی سماجی اِلزامات سے تنگ آ کر ایک دُوسرے کو اندھوں کے ماں باپ ہونے کا طعنہ دے دِیا کرتے تو اِن حالات میں ڈاکٹر صاحب کے والدِ گرامی جناب اللہ دِیا کا ارادۃً خُودکُشی کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

وہ شہر تھا گُونگوں بہروں کا کوئی درد کا مارا کیا کرتا
اُمید کوئی باقی نہ رہی تو دِل بے چارہ ٹُوٹ گیا

جس بچّے کی نشو و نُما یاس کے ایسے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ہُوئی ہو اور وہ محرُومیوں کا کوہِ ہمالیہ اُٹھائے ہُوئے ملٹن، ہومر، طٰہٰ حُسین اور ہیلن کیلر کی طرح اپنی اور بینا افراد کے من کی دُنیا روشن کرنے نکل کھڑا ہو تو اُسے دِیدہ ور کہلانے کا حق حاصل ہے، کیُونکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی قُوتِ برداشت اور باطنی صلاحیتوں کو بُروئے کار لا کر اپنی زندگی کو والدین کے لئے نیک نامی کا باعث بنایا۔ جو لوگ بچپن میں ڈاکٹر صاحب کی بینائی سے محرُومی کے باعث اپنے بچّوں کو اِن کے گھر میں کھیلنے کے لئے بھیجنے سے کتراتے تھے بعد میں وہ اپنی نسلوں کا مُستقبل روشن کرنے کے لئے اِن کے پاس یُونیورسٹیوں میں پڑھنے کے لئے بھیجتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بصیرت سے سفید چھڑی نامی ادارے کے ماتحت نابینا بچّوں کے لئے نہ صرف رُوزگار مُہیّا کیا بلکہ شادیاں تک کروا کے اُن کی زندگیوں کو بھیک کی آلُودگی سے بچائے رکھا اور تمسخر اُڑانے و کترانے والے آج ڈاکٹر صاحب کی بزم میں شمولیت کو اعزاز سمجھتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کے خاندان کا کوئی فرد اُنہیں کسی قسم کا طعنہ نہیں دے سکتا بلکہ اب تو ڈاکٹر صاحب کی اپنی اولاد اِس بات پر نازاں ہے کہ وہ موصُوف کے گھر پیدا ہُوئے۔

جس پہ ہار کے ہم نے جیت کے مزے لُوٹے
ہم وفا شعاروں نے عمر ایسی کھیلی ہے

درج بالا حالات میں ڈاکٹر صاحب کو ملنے والے بائیس اعزازات، اِن کی ادارت میں شائع ہونے والے "ماہنامہ سُفید چھڑی" پر مُحقّقین کی پی ایچ ڈی، دو درجن سے زائد آپ کی مطبُوعہ کُتب، آپ کی شخصیت پر سینکڑوں مقالہ جات، نوتجلّات (اقبال نمبر) کی اشاعت اور مُختلف یُونیورسٹیوں کی طرف سے چھ مقالہ جات کی اشاعت علامہ اِقبال کے دِیدہ ور کی گواہ ہیں اور اِس علمی و تحقیقی سفر میں جناب شاہد بُخاری جیسے عقیدت مندوں نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔

علامہ اِقبال کے لئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

میں اُن کے تفکّر کے پنگھوڑے میں پلا ہُوں
ہیں میرا مکاں، میرا جہاں حضرتِ اِقبالؒ

اِس نام سے ہم ایسوں نے بس نام کمایا
ہم ایسے کہاں اور کہاں حضرتِ اِقبالؒ

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ راقم جیسے شعرفہمی سے محرُوم افراد بھی اِس وادیٔ گُماں کی چہل قدمی اور سیاحت پر نکل پڑتے ہیں۔ اگر اِس سفر کا آغاز نعت سے ہو تو یہ سیاحت، مساحتِ قلب و جاں بن جاتی ہے۔

مرے سارے حرف تھے بے زُباں مری شاعری تھی فقط گُماں
تیری مِدحتوں کا کرم ہے سب یہ فصاحتیں یہ بلاغتیں
مرے لب پہ نعتِ رسُولؐ ہے مری خلوتیں مری جلوتیں
میں قسم خُدا کی مزے میں ہُوں مرے ہاتھ لگ گئیں دولتیں

ہر چند ڈاکٹر صاحب کی شہرت ایک مُستند اور قادرالکلام شاعر کی ہے لیکن زندگی کے اکثر موضُوعات پر ڈاکٹر صاحب کی منظُوم و منثُور طبع زاد تحریریں موجُود ہیں۔ ماہنامہ سفید چھڑی کے اِداریوں میں ہمیں معیاری اُردُو پڑھنے اور سیکھنے کو ملتی ہے لیکن موصُوف کی شاعری میں 10 جبکہ نثر کی 15 کُتب دستیاب ہیں۔

کِسی بھی فطری شاعر کا کلام نہ صرف اُس کی فطرت و جبلّت کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اُس کی روزمرّہ اُمیدوں، کامیابیوں، مایُوسیوں اور محرُومیوں کا نقش بھی کلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بے بصر زندگی کی آڑ میں ہماری سماجی و فکری بصارت و بصیرت سے محرُومی اور قحط الرّجال کو جس خُوبصُورتی سے بے نقاب کیا ہے، یہ اُنہی کا خاصہ ہے۔

جانِ تنہا زیست کا اندھا سفر
ساتھ کِتنے ہم سفر تھے، تھے کبھی
سب کی آنکھیں ہیں پہ بینائی نہیں
شہر سارے دیدہ ور تھے، تھے کبھی

ڈاکٹر صاحب حُسن کو شعر کی رُوح قرار دیتے ہیں۔ حُسن محبوب کے ظاہری جمال کی صُورت میں ہو یا شعری خیال، عُروض و اوزان کے باطنی سُروں سے مُزیّن ہو، شعر کو امر کر دیتا ہے۔ اِسی طرح کامیاب و ترقّی یافتہ مُعاشروں اور بامِ عُروج کو چھُونے والی اقوام کے لئے

ایسے افراد نے بھی جانیں قُربان کی ہوتی ہیں جن کا بظاہر تاریخ میں ذکر نہیں ملتا البتہ اُن کی نشاندہی کے لئے بہت کھوج لگانا پڑتی ہے۔

شعر میں ڈھلتا تو وہ شعر امر ہو جاتا
حُسن کو ہم نے کِسی شعر میں ڈھالا ہی نہیں
ان کِہنہ اور بھی ہیں سر کو کٹانے والے
ہاں مگر اُن کا کِتابوں میں حوالہ ہی نہیں

ایک پُختہ کار شاعر کا کلام معنوی اور فنی لحاظ سے ہمیشہ اپنے جوبن پر ہوتا ہے۔ چند نمونے مُلاحظہ ہوں:

وہ جن کو کارِ حکومت کا کُچھ تو ہو ادراک
ہم اپنے دِل کی ریاست اُنہی کے نام کریں

.....

ہم نے تو صِرف محبت کی ہے
عِشق کے روگ کو پالا ہی نہیں
جو ہر اِک فن کو جنم دیتا ہے
دِل نے وہ زخم سنبھالا ہی نہیں

.....

پیار میں ہار کا ہے اپنا مزہ
جان کر ہم نے جان واری ہے
جانِ من جان کِس طرح دے دُوں
یہ میری جان تو اُدھاری ہے
دِل سمندر میں جزیرے ہی جزیرے آباد
ہر تخیل میں بسا اِک جہاں ہوتا ہے
جب چُنی جاتی ہے دیوار میں اِک پھُول سی جاں
کعبۂ دِل میں وہی وقتِ اذاں ہوتا ہے

امجد بٹ
(مری)

ڈاکٹر اقبال ایک محیر العقول برق رفتار تخلیق کار

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے کتابوں سے میرا اٹوٹ رشتہ قائم رہا ہے اس حوالے سے تخلیق کاروں، ادیبوں اور فنکاروں سے بھی میرا پرانا اور مخلصانہ تعلق ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب جاننے کا عمل بڑا سطحی ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ سرگودھا میں ان کے قریب آیا ان کو پڑھا اور پڑھاتے دیکھا اور ان کے تخلیقی عمل میں ان کی ہمسفری بھی حاصل ہوئی اور پھر مجھ پر منکشف ہوا کہ ان کی اتنی جہتیں اور پہلو ہیں کہ کسی ایک پر بھی میری رائے کے مطابق سیر حاصل گفتگو نہیں ہو سکی۔ میں نے، اکادمی ادبیات پاکستان (اسلام آباد) کی کتاب ''پاکستانی ادب کے معمار'' میں مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ان کی رنگا رنگی اور بوقلمونی نذرِ قارئین کر سکوں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو پایا دراصل ان کا تنوع اور رنگا رنگی کچھ اتنی زیادہ ہے کہ پڑھنے والا حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے چھوڑ کر کہ نابینائی کے ہوتے ہوئے انہیں کتنی اذیتوں اور مشکلات سے گزرنا پڑا ہو گا یہ الگ موضوع ہے، جس پر حکومتی سطح پر غور ہونا چاہیے اور پھر ان کی مساعی طلبہ و طالبات کے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے تا کہ انہیں معلوم ہو سکے کہ زندگی یوں بھی گزاری جا سکتی ہے، ناکامیوں کو کامیابیوں میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر اقبال کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہیں ناممکنات کو ممکنات بناتے ہوئے ان کے حوصلے کا مشاہدہ کیا ہے۔ جہاں تک ان کی شاعری اور نثر کا تعلق ہے انہوں نے ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، ماہنامہ سفید چھتری کے اداریے جو چھ کتب کی صورت میں دستیاب ہیں انہیں پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ انہوں نے زندگی کو کس کس پہلو سے دیکھا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ڈاکٹر اقبال نے ناقدین سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ ان کی زیرِ نظر کتاب ''بے بال و پر'' ان کا گیارہواں شعری مجموعہ ہے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اردو، پنجابی، انگریزی اور

فارسی میں کس طرح اتنا اچھا کلام نذرِ قارئین کر دیا۔ کسی نے بھی ان کی اس بوقلمونی کو نظرِ غائر شاید ابھی تک نہیں دیکھا۔ نثر میں جتنا کام انہوں نے کیا ہے اس پر بھی بہت توجہ مرکوز نہیں کی جا سکی اور ان حلقوں تک ان کی نظم و نثر نہیں پہنچی جو ادبا اور شعراء کو انعام و اکرام سے نوازتے ہیں "تمغۂ امتیاز" انہیں ملا ضرور ہے مگر وہ اس سے کہیں زیادہ انعامات کے مستحق ہیں۔ ایک بہت بڑا انعام تو وہ حاصل کر چکے ہیں اور وہ ہے عوام الناس اور ان کے طلبا و طالبات کی محبت اور عقیدت۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شاعر اور ادیب عملی طور پر انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ہزاروں نابیناؤں کو زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ کرنے کے نجانے کتنے راستے تلاش کئے اور وہ نابینا احباب جو زندگی میں شاید کچھ بھی نہ کر پاتے اپنے علم و عمل سے زندگی کو ثروت مند کر رہے ہیں۔

پروفیسر شیخ اقبال کا بطور معلم تجزیہ ابھی ہم پر قرض ہے۔ میں نے ان سے اکتسابِ فیض بطور طالب علم حاصل نہیں کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے میں نے جانے زندگی کو کس کس پہلو سے دیکھنے کی قوت پیدا کی۔ لیکن میرے سینکڑوں ملنے والے، ان کے تلامذہ رہے ہیں، جس سے ان کا ذکر کیجئے وہ ان سے بے حد متاثر نظر آتا ہے اور کہتا ہے کہ اصل زندگی کی شناخت تو ہمیں ان کی تدریس سے ہی حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے سینکڑوں مضامین تحریر ہوئے ہیں لیکن ابھی ضرورت ہے کہ سرکاری طور پر اور غیر سرکاری طور پر جو تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور ادارے قائم ہیں وہ اس نابغۂ روزگار کی تخلیقات اور کاوشوں کا ذرا بغظرِ غائر مطالعہ کریں اور ضرورت یہ بھی ہے کہ طلبہ و طالبات کے نصاب کا حصہ بنایا جائے تا کہ انہیں پاکستان بھر کے نوجوانوں کے لئے رول ماڈل کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے علمی ادبی سفر کو جاری رکھیں اور مختلف جہتوں میں اپنی سرگرمیوں سے وطنِ عزیز کے باسیوں کے لئے تحریک کا باعث بن سکیں۔

شاہد بخاری ایڈووکیٹ

(لاہور)

نعتِ رسولِ مقبولؐ

مرے لب پہ نعتِ رسولؐ ہے مری خلوتیں مری جلوتیں
میں قسم خدا کی مزے میں ہوں مرے ہاتھ لگ گئیں دولتیں

مرے سر پہ شوق کا سائباں کڑی دھوپ ہے تو ہوا کرے
ہیں نظر میں طیبہ کے بام و در کوئی چیز ہیں یہ مسافتیں!

مرے سارے حرف تھے بے زباں مری شاعری تھی فقط گماں
تیری مدحتوں کا کرم ہے سب یہ فصاحتیں یہ بلاغتیں

تیری یاد میں شہِ دو جہاں، مرے قلب و جاں کو ملی اماں
نہ فلک سے کوئی گلہ رہا، نہ زمیں سے کوئی شکایتیں

ترے ذکر میں وہ سرور تھا، تری یاد میں وہ قرار تھا
مہ و سال کٹ گئے آن میں، شب و روز بن گئے رحمتیں

■

بے نواؤں کا جو سہارا ہے
وہ محبت کا استعارہ ہے

جو زمینوں پہ پھول بوتا ہے
آسمانوں پہ چاند تارا ہے

موت کو بارہا پچھاڑ دیا
زندگانی نے ہم کو مارا ہے

میں نے فی الفور اک غزل کہہ دی
جب کسی یاد نے پکارا ہے

زلفِ گیتی کو تا حدِ امکاں
حسنِ احساس سے سنوارا ہے

ہم سبھی ایک گھر میں رہتے ہیں
کیا ہمارا ہے! کیا تمہارا ہے!

جو سہارا تھا اوّلیں اپنا
بس وہی آخری سہارا ہے

کچھ بھی اپنا نہیں یہاں اپنا
جو بھی اپنا ہے وہ اُدھارا ہے

☆☆☆

☆

جو مڑ کے دیکھا تو پتھر میں ڈھل گیا ہوں میں
لگا تھا ایسے کہ آواز دے رہا ہے کوئی

■

ہم کو تو بچپنا بھی ہمارا نہیں ملا
کھیلن کو کوئی گیند غبارہ نہیں ملا

ہم چلتے جا رہے ہیں بڑے اعتماد سے
اچھا ہوا کہ کوئی سہارا نہیں ملا

ہم نے ہر ایک سانس کی قیمت چکائی ہے
جینے کو ایک پل بھی ادھارا نہیں ملا

دھرتی پہ، آسمان پہ، چل چل کے کٹ گئی
کوئی بھی پھول، کوئی ستارا نہیں ملا

جانے کہاں گیا مرا پیارا سا ہم سفر
لے لے کے نام اس کو پکارا، نہیں ملا

☆☆☆

■

کشکولِ درد و داغ میں اک چشمِ تر تو ہے
چھوٹے سے جاں مکان میں چھوٹا سا در تو ہے

صدیاں مہک رہی ہیں ارادوں کے پیڑ پر
میں جانتا ہوں زیست میری مختصر تو ہے

میں اب بھی کر رہا ہوں نئی بستیاں تلاش
پاؤں میں اب بھی تاب و تواں اس قدر تو ہے

میں سانس لے رہا ہوں بڑے طمطراق سے
موجود میری راکھ میں کوئی شرر تو ہے

ماضی کی دار و گیر سے باہر نکل کے چل
اک کل گزر گیا ہے مگر ایک کل تو ہے

ہم مانگتے ہیں زندگی کی ہر گھڑی دُعا
ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ دردِ سر تو ہے

اچھا ہے میرے پاس مکمل خبر نہیں
کیا ہو رہا ہے چار سو، کچھ کچھ خبر تو ہے

سائے میں جس کے بیٹھ کے کرتا ہوں شاعری
صد شکر میرے شہر میں کوئی شجر تو ہے

☆☆☆

☆

اے مرے چاند تجھ کو میری قسم
مجھ کو تھوڑی سی روشنی دے دے

زندگی اے زندگی

زندگی پہیلی ہے
کون بوجھ سکتا ہے!
فلسفے نے منطق نے
جانے کتنی صدیوں تک
اس کو بوجھنا چاہا
پر نہ کچھ بھی ہاتھ آیا
ہار مان لی آخر

صاحبانِ دانش کی
ساری خامہ فرسائی
کام کچھ نہیں آئی
شاعروں ادیبوں نے
اپنی غزلوں گیتوں میں
ناولوں فسانوں میں

اس کو بوجھنا چاہا
وہ بھی ہار مان گئے

زندگی لطیفہ ہے
کیا عجب لطیفہ ہے
ہنس کے رونا آتا ہے
رو کے ہنسنا آتا ہے

زندگی کہانی ہے
جانے کب سے جاری ہے
جانے کب مکمل ہو
زندگی ڈرامہ ہے
وقت کے سمندر پر
اک سٹیج ہے جس پر
صبح ہوتی رہتی ہے
شام ہوتی رہتی ہے
عہد سانس لیتے ہیں
عہد جاں سے جاتے ہیں

کوئی پیدا ہوتا ہے
کوئی موت کے منہ میں

زندگی پہیلی ہو
یا کوئی لطیفہ ہو
یا کوئی کہانی ہو
یا کوئی ڈرامہ ہو

پھر بھی سب کو پیاری ہے
پھر بھی ہم کو پیاری ہے
پھر بھی تم کو پیاری ہے

☆☆☆

☆

ہے اندھیرا غیض میں پر اس کی کچھ چلتی نہیں
اس کے بس میں ہو تو سارے چاند تارے نوچ لے
باغباں بیدار ہے گلچیں کا بس چلتا نہیں
باغ میں جتنے کھلے ہیں پھول سارے نوچ لے

■

تجھ کو جزوِ جاں بنانے کا ارادہ تھا مگر
جان و دل تجھ پہ لٹانے کا اِرادہ تھا مگر

تیرگی ہی تیرگی پھیلی تھی تا حدِ نظر
بستی بستی جگمگانے کا ارادہ تھا مگر

گردشِ ایام کے تیور بتاتے تھے مجھے
جانے کیا کیا کچھ زمانے کا ارادہ تھا مگر

جانے کیا کیا خواہشیں تھیں جانے کیا کیا خواب تھے
اِک نئی دنیا بسانے کا ارادہ تھا مگر

میرے سارے ہمسفر جب تھک تھکا کر سو گئے
مجھ میں کچھ ہمت دکھانے کا ارادہ تھا مگر

☆☆☆

■

دل ہوا مہرباں دیکھتے دیکھتے
ہو گیا میں جواں دیکھتے دیکھتے

ہم تھے ماتم کناں اک دیئے کے لئے
بجھ گیا آسماں دیکھتے دیکھتے

میرے اعصاب میں بجلیاں بھر گیا
ایک خواب و گماں دیکھتے دیکھتے

ایک گل، گلستاں بوستاں بن گیا
گلستاں بے نشاں دیکھتے دیکھتے

صرف میں ہی خدا جانے کیوں بچ گیا
کھو گیا کارواں دیکھتے دیکھتے

آدمی اک حقیقت تھا کتنی بڑی!
بن گیا داستاں دیکھتے دیکھتے

کھو گیا راہبر رہ بتاتے ہوئے
بھیڑ کے درمیاں دیکھتے دیکھتے

کیسا بھونچال تھا الحفیظ الاماں
ہر مکیں بے مکاں دیکھتے دیکھتے

حاجتیں مجھ کو اور تجھ کو کھا پی گئیں
میں کہاں تو کہاں دیکھتے دیکھتے

☆☆☆

☆

زندگی بار بار ہاری ہے
آخرِ کار میں ہی جیتا ہوں

صدائے بازگشت

جتنی اونچی تھی صدا میری
تری اس سے سوا
اس سے فزوں
تو بھی چلاتا رہا پیہم صدا
اور میں بھی چلاتا رہا
تا عمر چلاتا رہا
میں کسی صحرا میں خاکِ پائے تنہائی بنا
جیسے نہ تھا
تو کسی پگلے بگولے کے پروں پر اڑ گیا
جانے کہاں
جانے کہاں
یوں تیری میری کہانی
اک فسانہ بن گئی
اک زمانہ بن گئی

■

جاں کو بانہوں میں بھرتے رہتے ہیں
پھر بھی دن رات مرتے رہتے ہیں

وقت کی سیڑھیاں ہیں بے منزل
لوگ چڑھتے اُترتے رہتے ہیں

خوفِ احساس خوف ہے جس سے
ہم شب و روز ڈرتے رہتے ہیں

بے اثر آہیں بے ثمر آنسو
زخم لگتے ہیں بھرتے رہتے ہیں

خود سے کرتے ہیں سینکڑوں پیماں
اور خود ہی مکرتے رہتے ہیں

خود نکمّے ہیں اور قسمت پر
یوں ہی الزام دھرتے رہتے ہیں

بے کئے اپنے دن گزرتے نہیں
کارِ بے کار کرتے رہتے ہیں

کچھ ہیں اب بھی جو اپنی خوشبو سے
گل کو گلزار کرتے رہتے ہیں

کتنے ایسے ہیں چارہ گر جو ہمیں
اور بیمار کرتے رہتے ہیں

☆☆☆

اُف اللہ!

اُف اللہ یہ جلتا سورج
ہر سُو آگ اُگلتا سورج
جھلساتا پگھلاتا سورج
آگ کا دریا آگ سمندر
دل کے اندر دل کے باہر
یہ کیا میرے مشفق مولا!
بادل گرجا بادل کڑکا
ٹوٹ کے برسا
ہر آنگن میں دلکش ٹھنڈک
خنک ہوائیں دل بہلائیں
میرے اللہ میرے مولا!
ہر پل تیرے بس میں مولا
آگ لگا دے مینہ برسا دے
تیری مرضی تیری رضا ہے
جل تھل کر دے
آگ لگا دے

■

اک آس بندھا دیتی ہے پھولوں کی محبت
اک جوت جگا دیتی ہے پھولوں کی محبت

تپتے ہوئے صحرا ہوں کہ جلتے ہوئے جنگل
گلزار بنا دیتی ہے پھولوں کی محبت

نکہت کے گلستاں کہیں خوابوں کے جزیرے
پھولوں سا بنا دیتی ہے پھولوں کی محبت

پھولوں کے نگر میں کوئی بوڑھا نہیں ہوتا
ہاں عمر بڑھا دیتی ہے پھولوں کی محبت

ہر پل کوئی امید کوئی آس فروزاں
اک دیپ جلا دیتی ہے پھولوں کی محبت

اس پیار کے ہر لمحے میں اک زیست ہے پنہاں
اک آبِ بقا دیتی ہے پھولوں کی محبت

بیمارئ دل ہو کوئی بیمارئ جاں ہو
ہر اک کو شفا دیتی ہے پھولوں کی محبت

اک شعلۂ جوالہ بنا دیتی ہے جاں کو
ہونے کا پتہ دیتی ہے پھولوں کی محبت

☆☆☆

☆

صرف دو مصرعوں میں کیسے آ گئی
اتنی لمبی داستاں حیران ہوں
میں ترے پیچھے ہزاروں میل سے
میرے پیچھے اک جہاں حیران ہوں

■

نہ جاں کی بے بسی اچھی، نہ دل کی بے کلی اچھی
شگفتہ پھول کلیوں سے گھڑی بھر دل لگی اچھی

مجھے ہر حال میں ہنسنے ہنسانے کا ہنر بخشا
تری فرزانگی سے تو مری دیوانگی اچھی

سبھی اہلِ محلّہ ایک گھر کے فرد لگتے ہیں
مرا چھوٹا سا کچا گھر میری تنگ سی گلی اچھی

کہیں ایسا نہ ہو ہر بات کا افسانہ بن جائے
ہماری داستاں اے دوستو! بس ان کہی اچھی

ہزاروں پھول کلیاں آنکھ کی شاخوں پہ کھلتے ہیں
کلی جو دل میں مسکائے وہی دلکش وہی اچھی

کئی شعروں میں باندھا اور کئی مضمون لکھ ڈالے
کتابِ زندگی میں بات جو ہم کو لگی اچھی

میں ہوں اقبالؔ اور اقبالؒ میرے پیر و مرشد ہیں
خودی قربان کرنے سے تو یارو خودکشی اچھی

☆☆☆

حسن کی دیوی

پیار سراپا حسن مجسم
چاندی صورت سونی مورت
دن بھی اس کا
رات بھی اس کی
ہر پل اس کا
دل کی دھڑکن
روح کا نغمہ خواب کی صورت
نیند بھی اس کی بیداری بھی
اُف میرے مولا! کہاں گئی وہ
اس کو کب سے ڈھونڈ رہا ہوں
اپنی ہستی کھو بیٹھا ہوں

☆☆☆

■

آنکھ کو اشکبار رہنے دے
کوئی تو غمگسار رہنے دے

فکر و فن کی شگفتگی کے لئے
دل کو کچھ بے قرار رہنے دے

کھیل رکھ صرف کھیل تک محدود
کھیل میں جیت ہار رہنے دے

جیسے گزریں گزار دے راتیں
صبح کا انتظار رہنے دے

زخم ہائے حیات سہنا سیکھ
درد کو خوشگوار رہنے دے

جو ہے دریا کے بیچ اس کو ڈھونڈ
کیا ہے دریا کے پار رہنے دے

یہ ادائیں تیری ضرورت ہیں
ہے تجھے مجھ سے پیار! رہنے دے

عشق کے نام پہ دلوں سے نہ کھیل
اب تو یہ کاروبار رہنے دے

شاخِ دل پہ نہ کوئی پھول نہ پھل
اب کے جشنِ بہار رہنے دے

☆☆☆

☆

جس کی چاہت کو زندگی جانا
اس کی چاہت نے مار ڈالا ہے

آہِ نارسا

یہ کس کی چیخ اٹھی شب کے سینہ و دل سے
یہ کون چیخ اُٹھا شب کے آخری پل میں
عجیب چیخ میری روح کانپ کانپ اٹھی
عجب پکار میرا دل دہل گیا جس سے
بدن پگھل سا گیا
یہ کس کی چیخ ہے جو آسماں کو چیر گئی
زمین کانپ اٹھی چاند تارے ڈوب گئے
یہ چیخ اس کی نہ ہو جس کے گھر میں بھوک کا راج
وہ جس کے لختِ جگر بھوک بھوک کرتے ہوئے
نہ جانے رات کی باہوں میں کھو گئے کس پل
یہ چیخ اس کی نہ ہو جس کی آنکھ بینا ہے
جس کا در وزندہ ہے
نہیں نہیں میرے مولا یہ چیخ میری ہے
جو بہرے شہر میں ہرگز سنائی دیتی نہیں!

☆☆☆

■

امتحاں در امتحاں، تو کیا ہوا
اور ہم ہیں ناتواں، تو کیا ہوا

جیسے تیسے صبح ہو جائے گی شام
مہرباں نا مہرباں تو کیا ہوا

آؤ نا! مل کر اسے دلکش کریں
بے مزہ ہے داستاں، تو کیا ہوا

آؤ جاناں! جینا مرنا سیکھ لیں
ہے مخالف گر جہاں تو کیا ہوا

کوششیں کچھ تو ہوئی ہیں کامیاب
کچھ گئی ہیں رائیگاں تو کیا ہوا

دو گھڑی سستا لیں ہمت باندھ لیں
تھک گئے ہیں جسم و جاں تو کیا ہوا

آؤ پل پل میں تلاشیں اک صدی
وقت کم ہے میری جاں تو کیا ہوا

پھول کلیاں بلبلیں بیدار ہیں
سو گیا ہے باغباں تو کیا ہوا

بڑھ رہا ہے سوئے منزل کارواں
ہم نہیں ہیں درمیاں تو کیا ہوا

☆☆☆

☆

زندگی آج تک سہانی ہے
سب محبت کی مہربانی ہے

■

جادوگر شام و سحر تھے، تھے کبھی
ہر طرف برگ و ثمر تھے، تھے کبھی

رنگ و بو کی ہر ادا سے آشنا
صاحبانِ خوش نظر تھے، تھے کبھی

جانِ تنہا زیست کا اندھا سفر
ساتھ کتنے ہم سفر تھے، تھے کبھی

سارے گھر میں آج تنہائی کا رقص
رقص کرتے بام و در تھے، تھے کبھی

سب کی آنکھیں ہیں پہ بینائی نہیں
شہر سارے دیدہ ور تھے، تھے کبھی

آج وہ بے نام ہیں گم نام ہیں
جو کبھی پہلی خبر تھے، تھے کبھی

ہو گئے تاریخ کے غاروں میں دفن
زیست کے لختِ جگر تھے، تھے کبھی

☆☆☆

☆

میں نے چاہا تھا بھول جاؤں اُسے
اس نے یادداشت چھین لی میری

پریم نگر

جب میری آنکھ کے جزیرے میں
کوئی گلشن مہکنے لگتا ہے
کوئی طائر چہکنے لگتا ہے
کوئی بلبل صدا کے شانوں پر
کوئی دلکش سا گیت گاتی ہے
کوئی کوئل صبا کے شانوں پر
بیٹھ کے تیری میری چاہت کے
سینکڑوں گیت گنگناتی ہے
شادیانے سے بجنے لگتے ہیں
زندگی رقص کرنے لگتی ہے
پھر میرا دل، میرا انوکھا دل
جانے کیونکر مچلنے لگتا ہے
ہر گھڑی مسکرانے لگتی ہے

اور لمحوں کے پھول ہونٹوں پر
صرف تیرا ہی نام آتا ہے
پھر میں کتنے ہی گیت بُنتا ہوں
میں جو تنہا تھا، بزم کی صورت
زندگی کے نگار خانے میں
اپنی حالت پر رشک کرتا ہوں
اور پھر نت نویلے لفظوں میں
جانے کتنے ہی رنگ بھرتا ہوں
لفظ پھر گیت بُننے لگتے ہیں
حرف غزلوں میں ڈھلنے لگتے ہیں
میں کہ جو میں تھا
میں نہیں رہتا
تم کے ساگر میں ڈوب جاتا ہوں
گاہے ہنستا ہوں، گاہے گاتا ہوں
اور ہر درد بھول جاتا ہوں

☆☆☆

■

زندگی اتنی دردِ سر تو نہ تھی
شاخِ جاں اتنی بے ثمر تو نہ تھی

چند لمحوں میں کٹ گئی کیسے
زندگی اتنی مختصر تو نہ تھی

چپے چپے پہ پھول بکھرائے
ہر گلی تیری راہ گزر تو نہ تھی

میری جھولی میں گر گیا آ کر
میری اس پھول پہ نظر تو نہ تھی

کتنے پتھر بنا دیئے انساں
شاعری میری جادو گر تو نہ تھی

جانے کس کس کا ہاتھ ہاتھ میں تھا
زیست بس میری ہم سفر تو نہ تھی

☆☆☆

■

ہم تمہارے تم ہمارے تھے کبھی
جھولیوں میں چاند تارے تھے کبھی

ہم نے ہر پربت کو رائی کر دیا
کوئی بتلائے کہ ہارے تھے کبھی!

یاد ہے ہم کو بہت کچھ یاد ہے
آپ کی آنکھوں کے تارے تھے کبھی

اب سمندر ہی سمندر چار سُو
ہاں سمندر کے کنارے تھے کبھی

☆

کون دیتا جواب جانِ غزل
میرے لب پہ سوال کتنے تھے

درد کی پُروائی

درد کی پروائیوں نے زندہ کر ڈالا مجھے
درد کی انگڑائیوں نے پھر سے انساں کر دیا
میرے جسم و جاں میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں
میرے دست و پا میں خونِ زندگی دوڑا کیا
موت نے کس طور جانے مجھ کو زندہ کر دیا
پھر وہی شام و سحر کے کارواں چلنے لگے
پھر وفا کے زمزمے کانوں کو سہلانے لگے
جاگتی آنکھوں میں پھر سے خواب منڈلانے لگے
میرے پاؤں کو نئے رستے نظر آنے لگے
شاخِ ہستی پر کھلے پھر نت نئے سوسن گلاب
درد کی انگڑائیوں نے مجھ کو زندہ کر دیا

☆☆☆

■

کیا حسن انوکھا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں
ہر سمت اُجالا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

وہ جس نے میرے حرف کو بینائی عطا کی
اک چاند تھا تارہ تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

اِک شب تھی جو قد کاٹھ میں صدیوں سے بڑی تھی
دن کس طرح نکلا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

اک اَبر جو اِک بوند بھی برسا نہیں پایا
کس زور سے گرجا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

اِک دشت ہے صحرا ہے، جو پھیلا ہے ہر اِک سُو
اک بحر تھا، دریا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

اب دل نہیں پتھر ہے، جو سینے میں گڑا ہے
ہر آن دھڑکتا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

کس دھج سے نکلتا تھا ہر اِک دن مرے گھر میں
کس شان سے ڈھلتا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

وہ وقت بھی آیا کہ مری جاں پہ بنی تھی
جیتا تھا نہ مرتا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

منزل تھی نہ رستہ تھا، قدم آگے ہی آگے
اِک شوق چلاتا تھا، میں بُھولا تو نہیں ہوں

☆☆☆

☆

وہ اور ہوں گے جنہیں دل لگانا آتا ہے
ہمیں تو اپنی محبت پہ اختیار نہیں

■

بڑی مشکل سے دنیا سے نبھایا اور کیا کرتا
کھرا کھوٹا ہر اک سکہ چلایا اور کیا کرتا

غمِ ایام کے تیروں سے چھلنی جان تھی لیکن
ہر اک زخمِ جگر کو گنگنایا اور کیا کرتا

وہ اک دو لفظ جو میں نے کتابِ زیست سے سیکھے
انہی کو اُلٹا سیدھا لکھ دکھایا اور کیا کرتا

شکستہ بام و در، دیواریں ساری گرنے والی تھیں
اسی کو عمر بھر مسکن بنایا اور کیا کرتا

ہر اک در پر کھڑا تھا کوئی درباں، دل دھڑکتا تھا
میں ڈر کر اپنے گھر ہی لوٹ آیا اور کیا کرتا

تمہاری بات کوئی بات ہوتی بات بن جاتی
سنا میں نے جو تم نے کہہ سنایا اور کیا کرتا

☆☆☆

لبِ لعلیں

وہ لب کہ جن کی شاخوں پر
کھلتے تھے گل و گلزار و چمن
وہ لب کہ جن کی ایک جھلک
بوڑھوں کو جواں کر دیتی تھی
وہ لب کہ جن کی حرارت سے
ہر بات غزل بن جاتی تھی
ہر پتھر دل بن جاتا تھا
ہر رات سحر میں ڈھلتی تھی
دن روشن تر ہو جاتے تھے
ہر لمحہ گانے لگتا تھا
ہر پل مسکانے لگتا تھا

☆☆☆

☆

حسن تو اب بھی ہے، قاتل کافر
نہ سہی دیکھنے والا نہ سہی

■

جب گلشنِ جاں پہ برق گری تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا
تا حدِ نظر جب خاک اُڑی تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا

جب پیار کا دریا خشک ہوا سب رشتے ناطے چھوٹ گئے
انساں کی کہانی ختم ہوئی تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا

جب آس کی چھت دولخت ہوئی تو نام کا گھر بھی گھر نہ رہا
پھر ہمت کی دیوار گری تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا

اک شام تھی میں تنہا تنہا، کچھ سوئے لمحے جاگ گئے
گزرے لمحوں کی بزم جمی تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا

تڑپا تھا کہ ننگوں بھوکوں کے جینے کا کوئی سامان تو ہو
جب اس سے نہ کوئی بات بنی تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا

وہ شہر تھا گونگوں بہروں کا کوئی درد کا مارا کیا کرتا
اُمید کوئی باقی نہ رہی تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا

میں کہتا تھا ہے کہیں یہیں، مل جائے گا اک روز کہیں
ناکام پھرا میں گلی گلی تو دل بے چارہ ٹوٹ گیا

☆☆☆

☆

زمین اور بھی سنگلاخ ہوتی جاتی ہے
فلک کی آنکھ سے آنسو بہت نکلتے ہیں

■

وہ جتنے تیر تھے ترکش میں چل جاتے تو اچھا تھا
شبِ دیجور کے ارماں نکل جاتے تو اچھا تھا

ہمیں گھیرے ہوئے تھا ظلم و استبداد کا لشکر
تو ہم فولاد کی صورت میں ڈھل جاتے تو اچھا تھا

ہمیں صبر و تحمل سے زمیں پہ چلنا آ جاتا
کہیں آغاز میں پاؤں پھسل جاتے تو اچھا تھا

ہمیں کانٹوں میں جینے کا ہُنر لمحوں میں آ جاتا
کسی گل کی اداؤں پہ مچل جاتے تو اچھا تھا

غبارِ خاطرِ غم کچھ تو کم ہوتا سکوں ملتا
اگر آنکھوں سے کچھ آنسو نکل جاتے تو اچھا تھا

کوئی مردانگی ہے! ہم جلے غیروں کے ہاتھوں سے
ہم اپنی ذات کی آتش میں جل جاتے تو اچھا تھا

مگر ایسے ہماری شخصیت کا خون ہو جاتا
اگر ہم بھی تری صورت بدل جاتے تو اچھا تھا

☆☆☆

☆

نٹ کھٹ بالک، مکھیاں ماریں جی بہلائیں
جیسے دیوتا تیرا میرا خون بہائیں جشن منائیں

(شیکسپیئر کے ایک کردار کی پکار)

طائرِ وقت

یہ ایک لمحہ
یہ ایک پل ہے
یہ اک گھڑی ہے
کہ اک صدی ہے
میں جس میں جیتا رہا ہوں برسوں
میں جس میں مرتا رہا ہوں برسوں
حیات بُنتا رہا ہوں کب سے
ثبات دھنتا رہا ہوں کب سے
حسیں بناتا رہا ہوں کب سے
حسین بنتا رہا ہوں کب سے
حسیں رتوں کو نئے بتوں کو
گلے لگاتا رہا ہوں کب سے
یہ ایک لمحہ
یہ ایک پل ہے
یہ ایک گھڑی ہے
کہ اک صدی ہے
میں تھک گیا ہوں

میں گر گیا ہوں
سنبھالے کوئی
اُٹھالے کوئی
گلے لگائے
نہیں نہیں!
یوں نہیں چلے گا
میں خود اُٹھوں گا
میں خود بنوں گا
میں چل پڑوں گا
نشانِ منزل تراش لوں گا
تلاش لوں گا
یہ ایک لمحہ ہے
یہ ایک پل ہے
یہ اک گھڑی ہے
کہ اک صدی ہے

☆☆☆

■

اک خوابِ پریشاں، مجھے بُھولا تو نہیں ہے
اک حشر کا میداں، مجھے بُھولا تو نہیں ہے

وہ جس نے ہر اک شخص بنا ڈالا گداگر
وہ میر، وہ سلطاں، مجھے بُھولا تو نہیں ہے

وہ سیل کہ جس سیل میں اک میں ہی بچا تھا
وہ نوح کا طوفاں، مجھے بُھولا تو نہیں ہے

دل جس سے دھڑکتا ہے میرے سینے میں اب تک
وہ پیار کا پیماں، مجھے بُھولا تو نہیں ہے

وہ جس کی مہک آج بھی سانسوں میں بسی ہے
وہ گل، وہ گلستاں، مجھے بُھولا تو نہیں ہے

جو کچھ بھی ہوں میں آج فقط آپ کا احساں
اور آپ کا احساں، مجھے بُھولا تو نہیں ہے

جو آخری انساں مجھے خوابوں میں ملا تھا
وہ آخری انساں، مجھے بُھولا تو نہیں ہے

☆☆☆

خوف کا آسیب

لوگ خوف کے مارے
تن میں سکڑے بیٹھے ہیں
من کے قید خانے میں
صبح ہوتی رہتی ہے
شام ہوتی رہتی ہے
دن گزرتے رہتے ہیں
عمر بیت جاتی ہے
خاک چاٹ لیتی ہے
وقت کے نوکیلے دانت
ہڈیاں چباتے ہیں
خاک خاک میں مل کر
خاک بنتی رہتی ہے
زیست اک کہانی ہے
کیا عجب کہانی ہے

☆☆☆

■

میرے دل میں تمنا جاگتی ہے
یہی تو بس ثبوتِ زندگی ہے

نظر کا زاویہ بدلا ہے ورنہ
جو کل تک تھا وہ منظر آج بھی ہے

یہ بحر و بر بہت ہی پست قد ہیں
زمیں سے آسماں تک آدمی ہے

بہارِ رنگ و بو رقصاں ہے ہر سو
ہر اک منظر سحر کا زندگی ہے

یہ ہم سب لمحہ لمحہ مر رہے ہیں
حیاتِ چند روزہ دوڑتی ہے

☆☆☆

■

سوسن و گل کو کوئی دیکھنے والا ہی نہیں
دیکھنے والا اگر ہو بھی، اُجالا ہی نہیں

شعر میں ڈھلتا تو وہ شعر امر ہو جاتا
حُسن کو ہم نے کسی شعر میں ڈھالا ہی نہیں

ہم کوئی کام بھی ڈھب سے نہیں کرنے پائے
اِک عجب خوف ہے جو دل سے نکالا ہی نہیں

ان گنت اور بھی ہیں سر کو کٹانے والے
ہاں مگر اُن کا کتابوں میں حوالہ ہی نہیں

روز بہتا ہے گلی کوچوں میں انساں کا لہو
کوئی اب دستِ ستم تھامنے والا ہی نہیں

☆☆☆

ایک سوال

میں سوال کرتا ہوں
تم سوال کرتے ہو
وہ سوال کرتا ہے
کیا جواب دے کوئی!
کیا جواب دے کوئی!
فکر بھی پریشاں ہے
فن بھی غم گزیدہ ہے
وقت گنگ ہے کب سے
بے زباں تخیل ہے

☆☆☆

☆

مجھے خود ہی مر کے جینا ہے
اب میرا مسیحا کوئی نہیں

■

بہار آئی گئی دل نڈھال کر ڈالا
میری نظر نے مجھے پائمال کر ڈالا

وہ اک بات جو کہہ کر بھی ان کہی ہی رہی
اس ایک بات نے میرا یہ حال کر ڈالا

پلک جھپکتے ہوئی رنگ و نور کی بارش
جنونِ شوق نے کیا کیا کمال کر ڈالا

مرا گمان تھا بس بات بن چلی اب تو
میں لاجواب تھا ایسا سوال کر ڈالا

میرے حروف کے کشکول میں دھرا کیا تھا
بس اک نظر نے مجھے مالا مال کر ڈالا

مجھے خبر ہے کہ کس کس کا فیض ہے اقبالؔ
میں خاکِ پا تھا مجھے بے مثال کر ڈالا

☆☆☆

■

یہ کیسا شہر ہے انساں پگھلتے رہتے ہیں
جھلستی دھوپ میں تھوڑی سی روشنی کے لئے

کوئی حسین سی صورت کوئی حسیں سا خیال
کوئی سراب ضروری ہے زندگی کے لئے

کہاں گئیں وہ منڈیروں پہ نور کی لہریں
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ نا روشنی کے لئے

نہ جانے چلتے چلاتے کہاں نکل آئے
کوئی تو راہ تلاشو نا! واپسی کے لئے

خیال وخواب کے مرجھا گئے ہیں سوسن وگل
کوئی کھلونا کوئی کھیل دل لگی کے لئے

☆☆☆

■

ہم کیا خاک سنبھلتے، رستہ بھول گیا
کس رستے پہ چلتے، رستہ بھول گیا

نکل پڑے انجانے خواب جزیروں میں
دن کے ڈھلتے ڈھلتے، رستہ بھول گیا

آ نکلا طوفانِ باد و باراں میں
دیپ کو جلتے جلتے، رستہ بھول گیا

گھر کے اندر سارے رستے آتے تھے
باہر گھر سے نکلتے، رستہ بھول گیا

آگے پیچھے دائیں بائیں دریا تھا
کافر دل کے مچلتے، رستہ بھول گیا

ہر اک رستہ ہر اک منزل کھو بیٹھے
ہم کیوں رستہ بدلتے، رستہ بھول گیا

ہم چل نکلے الٹے سیدھے رستوں پر
ہم بھی عیش میں پلتے، رستہ بھول گیا

☆☆☆

شبِ تیرہ

رات کتنی لمبی ہے
رات کتنی بھاری ہے
اختتام کب ہوگا
ہم نہ ہوں گے ''تب'' ہوگا!
تب وہ کون دیکھے گا
یہ فقط خدا جانے
اور کوئی کیا جانے

☆☆☆

■

حیراں ہوں میرے شہر میں کیا کیا بدل گیا
ہر پیر و نوجوان کا قبلہ بدل گیا

پھر چل پڑا وہیں کہ جہاں سے چلا تھا میں
منزل پہ آ کے میرا ارادہ بدل گیا

چلتا رہا میں عمر بھر بس اتنا یاد ہے
منزل بدل گئی کبھی رستہ بدل گیا

میں نے تو ہر سوال کا ڈٹ کر دیا جواب
لیکن میں کیا کروں مرا پرچہ بدل گیا

میری محبتوں کے کرشمے ہیں دیدنی
دیکھا مجھے تو آگ کا دریا بدل گیا

اس دردِ ناشناس کے انساں کو دیکھ کر
ہر پل کا، ہر گھڑی کا، رویہ بدل گیا

اب بک رہی ہے برسرِ بازار زندگی
انسان باکمال تھا کتنا بدل گیا

پانی ہَوا لہو ہر سمے چاروں طرف ہے آگ
لمحوں میں میرا خواب جزیرہ بدل گیا

☆☆☆

مدھر آواز

کس کی ہے مدھر آواز
جو مجھے بلاتی ہے
جو مجھے لبھاتی ہے
میرے دل کا دھوکا ہے
وہم ہے تخیل کا
اب کہاں کوئی آواز
اور پھر مدھر آواز
اتنی دل نشیں آواز
اتنی جانفزا آواز

☆☆☆

■

اِک خیالِ خام اک وہم و گماں
مشترک ہے تیرے میرے درمیاں

سر پھرا ہے میرا شوقِ جستجو
میں زمیں پر ڈھونڈتا ہوں آسماں

کہنہ سالی ترکِ امیدِ بہار
آرزو رکھتی ہے انساں کو جواں

لوگ اُٹھ کر بزم سے جانے لگے
کون سنتا میری لمبی داستاں

ساتھ ہے میرے مقاصد کا ہجوم
میں اکیلا بن گیا ہوں کارواں

زندگی دو لخت ہو کر رہ گئی
پس گیا ہوں اپنے تیرے درمیاں

جو نہیں تھا دیکھنا دیکھا وہی
روشنی کی نعمتیں سب رائیگاں

ہر کسی کو اپنی اپنی پڑ گئی
آ گیا یومِ قیامت ناگہاں

☆☆☆

سُر لافانی ہے

یہ آنی جانی چیز نہیں
جیسے گھسیارن کا نغمہ
کوسوں تک فطرت کا شاعر
سنتا ہی رہا،
سنتا ہی رہا

☆☆☆

■

ہم بنے ہیں عمر بھر آنسو بہانے کے لئے
لوگ جیتے ہیں فقط ہنسنے ہنسانے کے لئے

سوچتا ہوں کچھ نہ کچھ کرلوں کہ دن ڈھلنے کو ہے
کچھ تو کرنا چاہیے نا! منہ دکھانے کے لئے

اپنی تو بس بات سی ہے بات بھی چھوٹی سی بات
سچ تو یہ ہے جی رہے ہیں ہم زمانے کے لئے

یہ ہمارا حوصلہ ہے پھر بنا لیتے ہیں گھر
آندھیاں چلتی ہیں بام و در گرانے کے لئے

کچھ زمین و آسماں کے مالک و مختار ہیں
اور کچھ چھت ڈھونڈتے ہیں سر چھپانے کے لئے

بے سکوں رکھتی ہیں دن بھر جھڑکیاں ہی جھڑکیاں
رات آ جاتی ہے پھر مرہم لگانے کے لئے

☆☆☆

■

منزلیں خوابِ پریشاں ہی سہی
راستے بھول بھلیاں ہی سہی

تم کو دانائی نے کیا دے ڈالا
میں جو ناداں ہوں ناداں ہی سہی

مذہبِ دل میں پلٹنا ہے حرام
دُور تک دشت و بیاباں ہی سہی

کب سے پھیلا تو ہوا ہے اب تک
خالی خولی مرا داماں ہی سہی

پھر بھی جینے میں بڑی لذت ہے
زندگی موت کا عنواں ہی سہی

☆☆☆

جھوٹ زندہ باد

لوگ ہر گھڑی ہر پل
جھوٹ لکھتے رہتے ہیں
جھوٹ پڑھتے رہتے ہیں
جتنی بھی کتابیں ہیں
جھوٹ کا پلندہ ہیں
جھوٹ کی حکومت ہے
جھوٹ خوب بکتا ہے
جھوٹ خوب چلتا ہے
سچ تو اک فسانہ ہے
سچ تو اک کہانی ہے
بے مزہ، پرانی ہے
لوگ ہر گھڑی ہر پل
جھوٹ لکھتے رہتے ہیں

☆☆☆

■

میں تھک کے بیٹھ رہوں اتنا ناتواں بھی نہیں
جھلستی دھوپ ہے اور کوئی سائباں بھی نہیں

تو کیا ہوا! کوئی منزل ملی نہیں مجھ کو
سفر حیات کا کچھ ایسا رائیگاں بھی نہیں

یہ جاں نواز مہک کس کے دم قدم سے ہے
مرے قریب کہیں کوئی گلستاں بھی نہیں

اسی مکان میں کٹتے ہیں روز و شب میرے
وہ جس مکاں کا کوئی دُور تک نشاں بھی نہیں

میں جس کو دوستو! ہر پل سنبھالے پھرتا ہوں
میں جانتا ہوں کہ وہ جان میری جاں بھی نہیں

بہت سے راز مری زندگی کا حاصل ہیں
کسے بتاؤں کوئی میرا رازداں بھی نہیں

☆☆☆

■

زخم ہو گا اتنا گہرا، ہم نے سوچا تک نہ تھا
درد ہو گا جان لیوا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

گاؤں کا تو ذکر ہی کیا، شہر دریا بن گئے
رات دن یوں ابر برسا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

یوں اُجڑ جائیں گی پل میں ہنستی بستی بستیاں
یوں بپھر جائے گا دریا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

یوں اڑے گی خاک ہر سُو کوچۂ و بازار میں
شہر بن جائیں گے صحرا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

مفلسی بے چارگی دیتی پھرے گی دستکیں
لب پہ ہو گا آٹا آٹا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

آپ نے تو مرتے مرتے ہم کو زندہ کر دیا
آ ملے گا آپ ایسا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

زندگی اک حادثہ اک المیہ بن جائے گی
جب تھا ہاتھوں میں کھلونا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

☆☆☆

کتنا مشکل ہے چار دن جینا

ہم جو چاہیں کہ چار دن جی لیں
کتنا مشکل ہے چار دن جینا
زندگی تیز دھوپ ہے اور ہمیں
کوئی امیدِ صبح و شام نہیں
کوئی جینے کا اہتمام نہیں
شاخِ دل ایک خشک ٹہنی ہے
کوئی امیدِ برگ و بار نہیں
ذہن اک دشتِ بے اماں ہے جہاں
دُور تک کچھ نظر نہیں آتا
جسم کو کوئی آس راس نہیں
ہم جو چاہیں کہ چار دن جی لیں
کتنا مشکل ہے چار دن جینا
زہرِ قاتل ہے عمر بھر پینا

چار دن تم جو میرے پاس رہو
زندگی خوشگوار ہو جائے
موسمِ برگ و بار ہو جائے
دشتِ دل لالہ زار ہو جائے
ہر گھڑی مشکبار ہو جائے
ہر کلی گلعذار ہو جائے
ہر کوئی غمگسار ہو جائے

☆☆☆

■

شکل وصورت سے گلستاں سا ہے
اس کا ہر فعل باغباں سا ہے

دھوپ ہے تیز اور سفر لمبا
سر پہ یادوں کا سائباں سا ہے

کب سے چلنے لگا ہوں یاد نہیں
پر سفر سارا رائیگاں سا ہے

میں اسے دُور سے تکوں کب تک
وہ جو اک شخص آسماں سا ہے

تھک بھی جاؤں تو نوجواں کر دے
وہ ارادہ جو نوجواں سا ہے

منزلیں دُور ہوتی جاتی ہیں
ہر کوئی خود سے بدگماں سا ہے

☆☆☆

■

ہم پر ایک ایک لمحہ بھاری ہے
زندگی پھر بھی ہم کو پیاری ہے

آخری سین جانے کب آئے
درد و غم کا ڈرامہ جاری ہے

دل سے کھیلو کہ جان سے کھیلو
دل تمہارا ہے جاں تمہاری ہے

سانحہ اس سے بڑھ کے کیا ہو گا
روشنی تیرگی سے ہاری ہے

پیار میں ہار کا ہے اپنا مزہ
جان کر ہم نے جان واری ہے

جانِ من جان کس طرح دے دوں
یہ مری جان تو اُدھاری ہے

زندگی کیا عجب تماشا ہے
آنکھ پر ایک وجد طاری ہے

☆☆☆

تمہارا چہرہ

تمہارا چہرہ تمہاری صورت
غزل ہو جیسے
غزل بھی میرؔ و منیرؔ کی ہو
غزل بھی فیضؔ و فرازؔ کی ہو
تمہاری آنکھیں خیامؔ کی ہوں رباعی جیسے
عدمؔ کا شیریں کلام جیسے
تمہارے ہونٹوں کی نازکی نے جنم دیئے ہیں
ہزروں شاعر، ہزاروں مطرب
تمہارے عارض قسم خدا کی
ہے چاند جیسے
گلاب جیسے
شباب جیسے

تمہاری ساحر گداز بانہوں نے زندگی دی
فصاحتوں کو
بلاغتوں کو
سروں کے رنگوں کے معجزوں کو
نہ جانے کتنے بنے مصور
نہ جانے کتنوں نے پتھروں میں
جمال ڈھونڈا حیات ڈھونڈی
نہ جانے کیا کیا جہاں سجائے
نہ جانے کیا کیا فسوں جگائے
بتاؤں کیسے کسے بتاؤں!
بتاؤں کیا کیا،
بتاؤں کیا کچھ

☆☆☆

■

جینے کے لئے خونِ جگر اور چاہیے
مرنے کے لئے گردِ سفر اور چاہیے

جلوؤں نے میری قوتِ بینائی چاٹ لی
گر اور دیکھنا ہو نظر اور چاہیے

میرے دنوں کے شام و سحر خستہ و خراب
ان کی بُنت میں رنگِ ہنر اور چاہیے

جتنے بھی راستے تھے سبھی بند ہو گئے
منزل کے لئے راہ گزر اور چاہیے

او! دینے والے تو نے بہت کچھ دیا مجھے
میری ہوسِ دل کو مگر اور چاہیے

ہر گھر میں کوئی بھوت کوئی جن مقیم ہے
رہنے کے لئے کوئی نگر اور چاہیے

خنجر لئے کھڑا ہے ابھی وقت کا یزید
اس کو کوئی سینہ، کوئی سر اور چاہیے

ہے تشنہ لب ہنوز میرے شوق کا جنوں
شاخِ نظر پہ کوئی ثمر اور چاہیے

☆☆☆

■

پڑ گیا ہے خود سے چہرہ ڈھانپنا
کس طرح کرتا میں اپنا سامنا

ایک بیماری سی ہے کچھ بھی نہیں
سوچتے رہنا ہمیشہ سوچنا

جیسے آنکھیں ہوں نمائش کے لئے
دیکھنا بھی سرسری سا دیکھنا

اک قیامت ہے شعور و آگہی
اک جہنم ہے حقیقت جاننا

آئی بس حصے میں صدیوں کی تھکن
اک جنوں تھا میرا سر پٹ دوڑنا

آ گیا تھا تیرنے کا فن مگر
پڑ گیا ہے کشتیوں میں ڈوبنا

ہار جانا بھی ہے جزوِ زندگی
کیا ضروری ہے ہمیشہ جیتنا

کانپ اٹھتا ہوں میں اکثر سوچ کر
میں اکیلا، زندگی کا سامنا

آگے آگے آخرِ شب اور ہم
پیچھے پیچھے کچھ کھلونے، بچپنا

☆☆☆

واہ۔۔۔آہ!

یہ پھول پھل یہ تتلیاں
یہ رنگ و نور نکہتیں
یہ سُر کا سحر دلربا
یہ گیت کا سرورِ جاں
یہ شاعری کا گلستاں
غزل کی سبز وادیاں
یہ چاندسی، گلاب سی
حسین شہزادیاں
یہ زلف و لب کی جنتیں
یہ جاں نواز راحتیں
یہ کھو گئیں، گئی کہاں!
اُڑا کے کون لے گیا
وہ کون ایسا چور تھا

جو زندگی لُٹا گیا
جو روشنی بجھا گیا
جو نکہتیں جلا گیا
جو رنگتیں مٹا گیا
کہیں یہ میرے اپنے دل
اداس دل کی وحشتوں کا شر نہ ہو
اس کی بدنظر نہ ہو
اس کی چشمِ تر نہ ہو

☆☆☆

■

ہم کو اپنے قلب و جاں کو آزمانا چاہیے
نت نئی دھرتی نیا گردوں بنانا چاہیے

منزلیں ملتی رہیں تو زندگانی شاد کام
راستے کی تلخیوں کو بھول جانا چاہیے

نت نئے بے ساختہ اشعار ہوتے جائیں گے
کچھ ہنر اور کچھ طبیعت شاعرانہ چاہیے

دردِ انساں اور اپنی مختصر سی زندگی
دردِ انساں کے بیاں کو اک زمانہ چاہیے

ہم نے روشن کر لئے ہیں عزم و ہمت کے چراغ
اب کہیں رُکنا نہیں ہے چلتے جانا چاہیے

راہ میں جتنے ہوں کانٹے پھول بنتے جائیں گے
مشکلوں میں خوب ہنسنا مسکرانا چاہیے

☆☆☆

خوف

خوف تخلیق بے یقینی کی
خوف دیمک ہے چاٹ جاتا ہے
ہر نئے خواب ہر تمنا کو
خوف سے دل کی خواہشیں مدھم
روح کے سارے گیت بے سُر و تال
خوف سے جاں کی نبض سُست قدم
خوف سے ہمتوں کا کوہِ گراں
دفعتاً چور چور ہوتا ہے
خوف سے آرزو کا ایک دریا
ایک قطرے میں آ سمٹتا ہے
خوف ہاتھوں کو باندھ دیتا ہے

خوف پاؤں میں بیڑیوں کی طرح
خوف جدّت کی راہ کا پتھر
ہر نئی سوچ کا یہ دشمن ہے
ہر نئی طرزِ زندگی کا رقیب
خوف ہے موت زندگی کے لئے
خوف ہے زہر آدمی کے لئے

☆☆☆

■

آدمی انسان ہے، کتنا پرانا جھوٹ ہے
ہر کہانی جھوٹ اس کی ہر فسانہ جھوٹ ہے

آپ کے چہرے پہ لکھے ہیں ہزاروں درد وغم
آپ کا ہنسنا ہنسانا مسکرانا جھوٹ ہے

جھوٹ کے اس شہرِ نا پرساں میں ہمت ہی نہیں
میں بتاؤں سچ ہے کیا کیا، اور کتنا جھوٹ ہے

عشق کی سب داستانیں، داستانیں ہی تو ہیں
حسن کا ہر ایک قصہ ہر فسانہ جھوٹ ہے

جو لکھا ہے میں نے نادم ہوں میں اس پر صاحبو!
جو پڑھا ہے میں نے، بچپن سے کہاں! جھوٹ ہے

وہ جو مفتی کہہ رہا ہے کہنے پہ مجبور ہے
اور واعظ کے لبوں پر بزدلانہ جھوٹ ہے

جو مغنی گا رہا ہے بے بس و مجبور ہے
اور اپنی شاعری بھی شاعرانہ جھوٹ ہے

کیسے سچ بولوں کہ سچائی کی گنجائش نہیں
میں اکیلا کیا کروں، سارا زمانہ جھوٹ ہے

☆☆☆

■

جرأت کی بات کی مگر جرأت نہ کر سکا
میں اپنی خواہشوں کی قیادت نہ کر سکا

میرے بہت سے خواب تھے اور خواب ہی رہے
میں اپنے روز و شب سے بغاوت نہ کر سکا

اقلیمِ ناز میں نہ میری بات بن سکی
میں تھا کہ مصلحت کی محبت نہ کر سکا

صوم و صلواۃ سارے رہینِ رسوم تھے
دل چاہتا جسے وہ عبادت نہ کر سکا

جس کو مری نظر نے مہ و مہر کر دیا
مجھ کو وہ اِک کرن بھی عنایت نہ کر سکا

بے التفاتیاں بھی مجھے پیار ہی لگیں
میں اپنے دوستوں کی شکایت نہ کر سکا

بابِ کرم پہ اِک ذرا دستک کی بات تھی
چاہا ہزار پر کبھی ہمت نہ کر سکا

☆☆☆

یادیں تھیں میری ہمسفر

یادیں تھیں میری ہمسفر
جانے جنونِ شوق میں
جانے وفورِ جذب میں
کتنے پہاڑ سر کیے
کتنے سمندروں کے بیچ
ڈوبتا تیرتا رہا
دشت تھے کتنے راہ میں
کتنے مہیب خوفناک بھوت تھے پریت تھے
اور میں چلتا رہا رُکا نہیں
شوق کے سلسلے دراز
عشق کے راستے ہزار
عزمِ جواں

عجیب شوق، جانے کہاں نکل گیا
کیا کیا نہ دیکھا آنکھ نے
کتنے حسین لوگ تھے
کتنے حسیں تھے صبح و شام
کتنی فضائیں دلنشیں
کتنی ہوائیں دلنواز
چہرے تھے کتنے پھول سے
صورتیں چاندسی حسیں
پھر نجانے کیا ہوا
پل میں جہاں بدل گیا
جانے کہاں پہ لے گئی
یاد تھی میری ہمسفر
وہ بھی کہیں بچھڑ گئی
شکلِ جہاں بدل گئی
پھول تھا نہ کوئی چاند
لمحوں میں دل اُجڑ گیا
جان بھی ہاتھ سے گئی

☆☆

■

فسردہ دل لگا دیتے ذرا تسکین ہو جاتی
ذرا ہنستے ہنسا دیتے ذرا تسکین ہو جاتی

یہ مانا زندگی کے شور و شر میں کون سنتا ہے
مگر پھر بھی صدا دیتے ذرا تسکین ہو جاتی

مری بے تاب آنکھوں میں کسی صبحِ بہاراں کا
کوئی منظر سجا دیتے ذرا تسکین ہو جاتی

مجھے معلوم ہے کہ زندگی بے رحم ہے لیکن
تم آتے، تھپتھپا دیتے ذرا تسکین ہو جاتی

تمہیں جانا تو تھا لیکن حسیں لمحوں کے صدقے میں
ذرا سا مسکرا دیتے ذرا تسکین ہو جاتی

ہزاروں بستیاں پھر سے بسانا تو نہیں ممکن
بس اک بستی بسا دیتے ذرا تسکین ہو جاتی

☆☆☆

■

وہی ہے سرو سمن دلکشی نہیں ملتی
وہی ہے گل کی پھبن نازکی نہیں ملتی

میں لا مکاں میں چلا ہوں تلاشنے خوشیاں
کسی مکاں میں مجھے اب خوشی نہیں ملتی

نہ جانے کتنے سمندر کھنگال مارے ہیں
ہمیں تو کوئی کہیں جل پری نہیں ملتی

نہ جانے کتنے ہیں جو قافیوں سے کھیلتے ہیں
کسی کلام میں پر شاعری نہیں ملتی

کوئی بھی چیز نہیں ان دنوں ٹھکانے پر
جو ایک ملتی ہے تو دوسری نہیں ملتی

کچھ ایسے ڈھب سے تراشی ہے زندگی ہم نے
کہ اک سکوں کی کوئی رات بھی نہیں ملتی

☆☆☆

■

زندگی اپنی سُونے گھر سی ہے
شاخِ امکاں بھی بے ثمر سی ہے

کتنے لمبے ہیں مفلسی کے دن
زندگی گرچہ مختصر سی ہے

کھانے پینے میں صرف کٹتی رہے
زندگی پھر تو جانور سی ہے

غم تو پہلے ہی دشمنِ جاں تھا
اب مسرت بھی دردِ سر سی ہے

علم کی اصل جہل و نادانی
ہر خبر اب تو بے خبر سی ہے

شعلے اٹھتے ہیں جسم سے جاں سے
صورتِ عشق جلتے گھر سی ہے

اشہبِ روز و شب ہے اور ہم ہیں
زندگی اپنی اک سفر سی ہے

☆☆☆

■

مجھے اک چارہ گر نے مار ڈالا
مجھے اک ہم سفر نے مار ڈالا

نہ جانے کب سے اڑتا جا رہا ہوں
مجھے تو بال و پر نے مار ڈالا

میں گنتا رہ گیا دن زندگی کے
مجھے شام و سحر نے مار ڈالا

نشانہ میں نہیں تھا جانے کیسے
تیرے تیرِ نظر نے مار ڈالا

بنا گھر اچھی خاصی کٹ رہی تھی
وبالِ بام و در نے مار ڈالا

کسی کے غم نے میری جان لے لی
کسی کی چشمِ تر نے مار ڈالا

عذابِ جاں بنا اک پھول چہرہ
کسی رشکِ قمر نے مار ڈالا

☆☆☆

■

جب کسی دل میں کوئی عزم جواں ہوتا ہے
منجمد خون بھی رگ رگ میں رواں ہوتا ہے

اک عجب درد ہے سونے نہیں دیتا مجھ کو
پر یہ معلوم نہیں درد کہاں ہوتا ہے

لکڑیاں کیسی ہیں یہ راکھ تو بن جاتی ہیں
آگ جلتی ہی نہیں صرف دھواں ہوتا ہے

ہر مکاں کے لئے لازم ہے مکینوں کا وجود
بھوت آ بستے ہیں جب خالی مکاں ہوتا ہے

دل سمندر میں جزیرے ہی جزیرے آباد
ہر تخیل میں بسا ایک جہاں ہوتا ہے

یہی تعبیر ہے کیا اتنے حسیں خوابوں کی
روزِ روشن پہ بھی اب شب کا گماں ہوتا ہے

بس اُسی شعر کو ہم جانِ غزل کہتے ہیں
جس میں گر گر کے سنبھلنے کا بیاں ہوتا ہے

جب چُنی جاتی ہے دیوار میں اک پھول سی جاں
کعبۂ دل میں وہی وقتِ اذاں ہوتا ہے

ہر تبسم کے بطن میں کئی شیون پنہاں
ہر رگِ ساز میں اک سوزِ نہاں ہوتا ہے

دیکھتے دیکھتے تاریکی میں ڈھلتا ہوا دن
ہر سحر کے لئے عبرت کا نشاں ہوتا ہے

میں کسی موڑ پہ تنہا نہیں ہوتا اقبالؔ
میرے پہلو میں بسا ایک جہاں ہوتا ہے

☆☆☆

■

جب کوئی دیکھنے والا ہی نہیں
جو اجالا ہے اجالا ہی نہیں

ہم نے تو صرف محبت کی ہے
عشق کے روگ کو پالا ہی نہیں

آج کس طرح کا سورج نکلا
جس کی پوروں میں اُجالا ہی نہیں

وہ جو کچھ بھی نہیں کرنے دیتا
دل سے وہ خار نکالا ہی نہیں

جو ہر اِک فن کو جنم دیتا ہے
دل نے وہ زخم سنبھالا ہی نہیں

جانے کتنے تھے کھڑے ہی رہتے
ہم نے گرتوں کو سنبھالا ہی نہیں

لاش کے گرد تماشائی ہیں
کوئی شیون کوئی نالہ ہی نہیں

☆☆☆

■

جو احترام کے قابل ہوں احترام کریں
جو لوگ سنتے نہیں ان کو کیوں سلام کریں

چلے بھی آؤ کہ ہم زندگی کی شام کریں
جو کام چھوڑا ہوا ہے اُسے تمام کریں

بہت سے پیار کئے ہم نے اجنبی دلبر!
جو بچ رہے ہیں سبھی آج تیرے نام کریں

ہمیں تو چاٹ گئی صبح و شام کی دیمک
خود اپنا وقت تراشیں مزے سے کام کریں

یہ کیا کہ نوچ کے کالر میں ٹانک لیں پل بھر
گلوں کو شاخ پہ رہنے دیں حسن عام کریں

یہ اژدحام تو پاگل بنا کے رکھ دے گا
چلو نا! پھولوں سے کلیوں سے کچھ کلام کریں

وہ جن کو کارِ حکومت کا کچھ تو ہو ادراک
ہم اپنے دل کی ریاست اُنہی کے نام کریں

☆☆☆

☆

مختصر سی مری کہانی ہے
جس کو تم نے طویل کر ڈالا
کیا حسین و جمیل کر ڈالا

■

انساں کو ستاتا ہے جو انسان نہیں کیا!
انسان کے بہروپ میں شیطان نہیں کیا!

پھولوں سے مہکتے ہوئے یہ چاند سے چہرے
انساں کے حسیں خواب کا عنوان نہیں کیا!

میں کیوں نہ اسے ٹوٹ کے سینے سے لگا لوں
وہ میرا مسیحا، وہ مری جان نہیں کیا!

پھر کیا کہ مجھے دیکھ کے دیکھا نہیں اس نے
اے دل تجھے اپنوں کی بھی پہچان نہیں کیا!

جیئے گا جہاں میں وہی جو جیت سکے گا
یہ زیست بھی اک جنگ کا میدان نہیں کیا!

ممکن ہے کہ کھیلن کو مجھے چاند لگے ہاتھ
امکان کی دنیا میں یہ امکان نہیں کیا!

ہے سب کو کسی چاند کسی گل کی تمنا
سب لوگ بھی میری طرح نادان نہیں کیا!

میں کیوں نہ کروں پیار حسیناؤں سے اقبالؔ
ہے حسن صداقت میرا ایمان نہیں کیا!

☆☆☆

■

ہم ہیں ایک کونے میں زندگی حویلی ہے
ہم کو کیا خبر کتنے ایکڑوں میں پھیلی ہے

آؤ دیکھیں یہ کس کی تشنگی بجھاتی ہے
تشنہ لب ہی تشنہ لب، آبجو اکیلی ہے

فلسفہ و حکمت نے ہار مان لی آخر
زندگی پہیلی تھی زندگی پہیلی ہے

ریزہ ریزہ کر ڈالا ہم بتاؤ کیا کرتے
خواہشوں کا لشکر ہے ایک جاں اکیلی ہے

دل کو کیا بُرا کرنا کیا شکائتیں کرنیں
اک جہاں مخالف ہے پر خدا تو بیلی ہے

جس میں ہار کے ہم نے جیت کے مزے لوٹے
ہم وفا شعاروں نے عمر ایسے کھیلی ہے

☆☆☆

☆

کچھ بھی تو بے سبب نہیں ہوتا
اپنا تحقیق کا مزاج نہیں
جانے کتنے عمل سے کوسوں دور

■

مجھے گلستاں کی تلاش ہے مجھے بوستاں کی تلاش ہے
مجھے اپنے دشتِ وجود میں کسی مہرباں کی تلاش ہے

مجھے کیا خبر! کہاں رکھ دیئے، کہاں رہ گئے، کہاں لُٹ گئے
کبھی اپنے دل کی تلاش ہے کبھی اپنی جاں کی تلاش ہے

میرا منحنی سا ہے تن بدن کسی کام کا نہیں دوستو!
وہ جو پتھروں میں پنپ سکے مجھے ایسی جاں کی تلاش ہے

میں ہنسا ہوں اپنے پہ بار ہا کہ عجیب ہے میری آرزو
میں مکاں کی قید میں ہوں مگر، مجھے لامکاں کی تلاش ہے

میں نئے مزاج کا آدمی مجھے کچھ پرانا نہیں پسند
نئی سرزمیں کی تلاش ہے نئے آسماں کی تلاش ہے

☆☆☆

■

رُخِ دریا بدلتا جا رہا ہے
ہر اک بستی نگلتا جا رہا ہے

بچا لو اے طبیبو، چارہ سازو!
دمِ انساں نکلتا جا رہا ہے

کچوکے ہجر کے کم ہو گئے ہیں
مزاجِ غم بدلتا جا رہا ہے

وہ جس کا لمحہ لمحہ زندگی ہے
وہ دن لمحوں میں ڈھلتا جا رہا ہے

وہ جس کی کوئی بیخ و بُن نہیں ہے
ہمیں وہ ڈر لگتا جا رہا ہے

ہم اک نقطے میں پھنس کر رہ گئے ہیں
زمانہ ہے کہ چلتا جا رہا ہے

طبیبِ وقت کی نظرِ کرم ہے
مریضِ غم سنبھلتا جا رہا ہے

☆☆☆

☆

پھول کے چار سانس ہیں لیکن
خوب ہنستا ہے مسکراتا ہے
پھر کہیں بستیاں بساتا ہے

■

آنکھ سے کوئی دیکھتا ہی نہیں
ذہن سے کوئی سوچتا ہی نہیں

آدمی ہر دکاں پہ وافر ہے
کوئی اس کو خریدتا ہی نہیں

حسن اب بھی ہے دلکشا لیکن
کوئی بھی رُک کے دیکھتا ہی نہیں

اہلِ یونان جھوٹ کہتے تھے
عشق کا کوئی دیوتا ہی نہیں

زیست کے سارے در مقفل ہیں
کوئی بھی بڑھ کے کھولتا ہی نہیں

آگے پیچھے زبان چلتی ہے
وقت پر کوئی بولتا ہی نہیں

وقت کس خواب کے طلسم میں ہے
کب سے سویا ہے جاگتا ہی نہیں

بدلا بدلا ہے بارشوں کا مزاج
کچھ بھی اب پھلتا پھولتا ہی نہیں

☆☆☆

■

سخت تھی آب و ہوا کیا کرتا
کچھ نہ اُگنے کا گلہ کیا کرتا

ذہن نے لوٹ لی ہر ایک خوشی
دل بغاوت کے سوا کیا کرتا

کوئی بھی اور سہارا ہی نہ تھا
درد ہمت کے سوا کیا کرتا

بادِ صرصر سے بڑھا لیں پینگیں
تیرا اک جھونکا صبا! کیا کرتا

جاں نے ہر حکم پہ لبیک کہا
جان کو دل سے جدا کیا کرتا

زیست فیاض بہت تھی لیکن
میں تجھے پا کے دعا کیا کرتا

☆☆☆

☆

عشق کیا خوش لباس ہے لیکن
ہم اسے بے لباس کرتے ہیں
زندگی کو اداس کرتے ہیں

■

حسنِ الفاظ کی ہے جادوگری
لگ گئی ہاتھ میرے سبز پری

کتنی لمبی مری کہانی ہے
زندگی سنتے سنتے تھک سی گئی

نیتِ باغباں کا حاصل ہے
کوئی غنچہ کھلا نہ کوئی کلی

یار لوگوں کی صرف باتیں ہیں
زندہ رکھتی ہے صرف زندہ دلی

اور جب کچھ ملا نہ ہنسنے کو
اپنے ہونے پہ زندگانی ہنسی

بزم میں میری بات کیا بنتی
پیر ہے کوئی اور کوئی ولی

ساحری ہے یہ نگار خانۂ حُسن
دل لگی بن گئی ہے دل کی لگی

☆☆☆

☆

موت کے ساتھ کٹ رہے ہیں دن
زندگی کا لباس پہنے ہوئے
جانے کب بے لباس ہو جائیں

■

انسان تو آزاد ہے لاچار کہاں ہے!
صدیوں کی جو کاوش ہے وہ بے کار کہاں ہے

میں نے تو اسے خونِ دل و جاں سے تراشا
وہ میرا مسیحا مرا شاہکار کہاں ہے

میں ڈھونڈتا رہتا ہوں اسے، دشت و کھنڈر میں
وہ پیار کا اک لمحۂ سرشار کہاں ہے

جس نے مجھے حیوان سے انسان بنایا
یہ درد کی دولت مری بے کار کہاں ہے

ہارا ہوں میں سو بار مگر دل نہیں ہارا
یہ سعیِ مسلسل ہے مری ہار کہاں ہے

طوفانِ بلا خیز نے گھر لوٹ لیا ہے
آنگن کہاں اور دَر کہاں دیوار کہاں ہے

اب ہر کوئی پھرتا ہے اٹھائے ہوئے خود کو
انسان کو انساں سے سرو کار کہاں ہے

☆☆☆

☆

تو میرے خواب کا کھلونا ہے
جانے کس وقت آنکھ کھل جائے
اور تو پھر کہیں نہ مل پائے

■

جو بیتی ہے بھلا دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے
ذرا سا مسکرا دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے

دراڑیں پڑ بھی جاتی ہیں کبھی گھر گر بھی جاتے ہیں
انہیں کچھ حوصلہ دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے

جسے تم ٹوٹ کر چاہتے تھے تم کو بھول بیٹھا ہے
چلو تم بھی بھلا دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے

نہ جانے لوگ کتنے روز و شب الزام دھرتے ہیں
تمسخر میں اڑا دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے

مری جاں نا اُمیدی کفر ہے غم آتے جاتے ہیں
غموں کو گنگنا دو نا! کہ ایسا ہوتا رہتا ہے

☆☆☆

■

کون سنتا ہے بھلا رام کہانی میری
یہ نیا دور ہے اور بات پرانی میری

میں کہ جکڑا ہی رہا پیٹ کی زنجیروں میں
کھا گئیں مصلحتیں فصلِ جوانی میری

لے اُڑا جانے کہاں درد کا جلتا سورج
صبح کی ٹھنڈی ہوا رات سہانی میری

مضحکہ خیز ہے لافانی بنانے کا جنوں
جبکہ معلوم ہے یہ عمر ہے فانی میری

مجھ کو بھٹکاتا رہا وہم کے صحراؤں میں
لاکھ سمجھایا مگر دل نے نہ مانی میری

ہر نیا گھر کسی آسیب کا مسکن نکلا
کچھ بھی کام آئی نہیں نقل مکانی میری

اس کی خاموشی نے وہ برق گرائی اقبالؔ
دم بخود رہ گئی ہر شعلہ بیانی میری

☆☆☆

■

کیسے سچ بولتا جھوٹ تھا حکمراں
میرے سچے خدا کوئی چارہ نہ تھا

ٹوٹ جانا بھلا کوئی دانائی تھی
چپ رہا جھک گیا کوئی چارہ نہ تھا

زندگی تلخ تھی کٹ گئی کاٹ دی
اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

☆☆☆

■

آ گئے ہم کہاں خدا جانے
یہ جہاں ہے جہاں! خدا جانے

دل میں کیا کچھ ہے جانے کہنے کو
کب ملے گی زباں، خدا جانے

دل تو بٹ ہی گیا حسینوں میں
جاں بھی ہے میری جاں، خدا جانے

لوگ اب آسماں پہ بستے ہیں
ہے کہاں آسماں! خدا جانے

میں اکیلا ہوں دشتِ ویراں میں
کیا ہوا کارواں، خدا جانے

لے اُڑا ایک ہی نظر میں کون
میرا نام و نشاں، خدا جانے

جو نہاں ہے عیاں ہوا کب ہے
کب عیاں ہو نہاں، خدا جانے

کس کے افسوں سے آج تک آباد
محفلِ این و آں، خدا جانے

☆☆☆

■

دل میں ارماں بہت مچلتے ہیں
کب حقیقت میں خواب ڈھلتے ہیں

بوس کی جھڑکیاں بھلانے کو
دوستو! آؤ گھر کو چلتے ہیں

کھا گیا جسم وقت کا دیمک
پھر بھی خوابوں کے دیپ جلتے ہیں

معجزوں کے تو ہم نہیں منکر
دل جو پتھر ہیں کب پگھلتے ہیں!

چند برسوں کی عشرتوں کے عوض
عمر بھر لوگ ہاتھ ملتے ہیں

جب کوئی اپنا چھوڑ جاتا ہے
اشک بے ساختہ نکلتے ہیں

ہے کرم زیست کے تھپیڑوں کا
جب بھی گرتے ہیں خود سنبھلتے ہیں

چند لمحوں کا پیٹ بھرنے کو
کتنے پھولوں کا خون کرتے ہیں

☆☆☆

☆

بیٹھ کر پیار کی سواری پر
جانے کس راہ سے وہ گزرے گا
میں نے ہر راستہ سجا ڈالا

■

میں اپنے آپ سے گھبرا گیا ہوں، مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے
نہ جانے ہوش میں کیوں آ گیا ہوں، مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے

گلی کوچوں میں نعرے سنتے سنتے مرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں
تلے میں بھیڑ کے کچلا گیا ہوں، مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے

میں انساں ہوں مگر اشیاء کی صورت دکانِ زیست پہ رکھا ہوا ہوں
خریدا اور کبھی بیچا گیا ہوں، مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے

میں دستِ غیب میں ہوں اک کھلونا، برابر ہے مرا ہونا نہ ہونا
کبھی جوڑا کبھی توڑا گیا ہوں، مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے

لگے ہیں زخم کاری قلب و جاں پر حقیقت کے کبھی وہم و گماں کے
میں نامِ زیست پہ مارا گیا ہوں، مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے

☆☆☆

خودی

میں سے میں ہوں
میں سے تُو
میں سے ساری کائنات
میں سے میرے سر پہ پھیلا آسماں
میں سے میرے پاؤں کے نیچے زمیں
میں سے بحرِ بے کنار و بے حساب و بے حدود
میں سے پھیلا دشت تا حدِ نظر
میں سے دل کش دلنشیں شاموں کا حسن
میں سے صبحِ تازہ دم تازہ قدم
میں سے لمحوں کا سرودِ جاوداں
میں سے آنکھوں کا فورِ مہر و ماہ فردوسِ گوش

میں نہیں تو زندگانی موت ہے
میں نہیں تو گلشنِ ہستی سراب
میں نہیں تو خامشی ہی خامشی
میں نہیں تو کوئی فردا ہے نہ دوش
میں نہیں تو بے مزہ ہر سوز و ساز
میں نہیں تو زندگی ہے بے لباس

☆☆☆

بہ نذرِ علامہ اقبالؒ

ہیں آج بھی نس نس میں رواں حضرتِ اقبالؒ
رکھتے ہیں مجھے اب بھی جواں حضرتِ اقبالؒ

میں ان کے تفکر کے پنگھوڑے میں پلا ہوں
ہیں میرا مکاں، میرا جہاں حضرتِ اقبالؒ

اس نام سے ہم ایسوں نے بس نام کمایا
ہم ایسے کہاں اور کہاں حضرتِ اقبالؒ

اک ولولۂ تازہ ہر اک فرد کو بخشا
قوت کا اخوت کا نشاں حضرتِ اقبالؒ

کیوں پست ہیں کمزور ہیں دنیا کی نظر میں
ملت کے لئے تاب و تواں حضرتِ اقبالؒ

امید کا سورج لئے اک صبحِ درخشاں
مہتابِ دلِ شب زدگاں حضرتِ اقبالؒ

☆☆☆

سلام امام حسینؓ

موت بنی ہے زندگی، ایک حسینؓ بھی نہیں
پھیل رہی ہے تیرگی، ایک حسینؓ بھی نہیں

دستِ ستم سے آج بھی موت کی ندیاں رواں
کرب و بلا ہے آج بھی، ایک حسینؓ بھی نہیں

تیرہ شبی ہے چار سو، صبح کا کچھ پتہ نہیں
دے سکے جو روشنی، ایک حسینؓ بھی نہیں

کون کرے بھلا بلند، نعرۂ دینِ مصطفیٰؐ
خامشی ہی خامشی، ایک حسینؓ بھی نہیں

قافلۂ اُمید کا، کس کو بنائیں ہم امام
کیا عجیب بے بسی! ایک حسینؓ بھی نہیں

☆☆☆

دیگر کتب

شاعری:

1۔ساحلِ تشنہ لب	(1982)
2۔سوالیہ نشان (دو ایڈیشن)	(1989)(1993)
3۔اک ہمسفر اچھا لگا	(1998)
4۔تلاوتِ دل (مجموعہ حمد و نعت)	(1998)
5۔Love's no Crime	(2005)
6۔یہ کافر دل نہیں مانا	(2007)
7۔اس کے نام	(2014)
8۔نہ عشق نوں لیکاں لائیں	(2016)
9۔ابھی زندگی کا جواز ہے	(2017)
10۔کس کی یاد آ گئی	(2022)

تنقید:

1۔جون ڈن شخصیت اور شاعری	(1993)
2۔اقبال، بحضورِ اقبال	(1999)
3۔جون کیٹس شخصیت اور شاعری	(2001)

نثر:

1۔ذوقِ تماشا (1993)

2۔جہانِ مہ و پرویں (1997)

3۔دیدۂ دل (1998)

4۔کب رات بسر ہوگی (2001)

5۔آشوبِ آگہی (2007)

6۔مجھے ہے حکمِ اذاں (2012)

7۔ڈپریشن، علامات، اسباب اور علاج (2013)

8۔یا اللہ! (2018)

9۔اوٹ پٹانگ (انشائیے) (2020)

10۔فکر و خیال (2022)

خودنوشت:

1۔پردۂ تیمیں سے (چند سوانحی جھلکیاں) (2009)

زیرِ طبع: ''علامہ اقبال پر برطانوی شعراء کے اثرات''